بارہ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ وضاعین اور اہل تشیع کی روایتوں سے یکسر پاک ہیں اس ضمن میں ابن سعد، ابن جریر، ابن عبدالبر، ابن اثیر اور ابن کثیر کی کتابوں اور تاریخوں کی اصل حقیقت و نوعیت بھی واضح کی ہے وہ مولانا کی اس رائے پر بھی سخت بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں کہ تاریخی روایتوں کو جانچنے کے وہ طریقے صحیح نہیں ہیں جو احادیث کے لیے اختیار کیے گئے ہیں کیونکہ اس سے تاریخ اسلام خصوصاً قرن اول کا بڑا حصہ غیر معتبر قرار پائے گا اس کی تردید کے لیے مصنف نے حافظ ابن کثیر اور دوسرے علمائے اسلام کی کتابوں سے مثالیں نقل کرکے دکھایا ہے کہ ان حضرات نے بھی تاریخی روایات کے رد و قبول میں محدثین کے اصول نقد و جرح کو سامنے رکھا ہے، ایک باب میں خلفائے راشدین کے انتخاب کی نوعیت بیان کرکے ثابت کیا ہے کہ اس وقت ولیعہدی اور نامزدگی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا، حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی نامزدگی کی مخالفت دوسری وجہوں سے کی تھی اور حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کی نامزدگی کی تجویز کو غلط نہیں کہا تھا، وہ مولانا مودودی کی یہ رائے درست نہیں مانتے کہ خلفائے راشدین کے نزدیک خلیفہ کو عام مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رائے سے منتخب کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ طریقہ کسی خلیفہ کے انتخاب میں اختیار نہیں کیا گیا تھا، مولانا نے خلافت کی جو خصوصیات بتائی ہیں مصنف نے ان کو ذکر کرکے دکھایا ہے کہ وہ سب کم و بیش حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں بھی پائی جاتی تھیں، چوتھے باب میں پہلے حضرت عثمانؓ پر ان کے جن اقدامات کی وجہ سے اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا مدلل جواب دیا ہے، پھر حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق مولانا کے بیانات کا تضاد دکھایا ہے اور آخر میں جمل اور صفین کی جنگوں اور معاہدہ تحکیم وغیرہ کی انھوں نے جس انداز سے تصویر کشی کی ہے اس پر نقد کرکے اس کی خامیاں واضح کی ہیں، آخری باب میں ملوکیت کو اسلامی معاشرہ کے بگاڑ کا سبب قرار دینے کی تردید کی ہے اور حضرت امیر معاویہؓ پر اعتراضات کا جواب دیا ہے، مولانا مودودی نے متعدد صحابہؓ خصوصاً حضرت عثمانؓ و امیر معاویہؓ کے بارے میں جو ناروا لب و لہجہ اختیار کیا ہے مصنف نے اس پر جا بجا ناگواری ظاہر کی ہے، ان کو مولانا سے ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ حضرت عثمانؓ و امیر معاویہؓ وغیرہ کے بارے میں متداول تاریخوں کی ہر رطب و یابس روایت کو صحیح قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں اور ایسے موقع پر صحابہؓ کی عظمت و عدالت کی بھی پروا نہیں کرتے لیکن دوسری طرف حضرت علیؓ کے متعلق اسی قسم کی روایتوں کی چھان بین کی تلقین کرتے ہیں اور انھیں صحابہؓ کی عظمت و عدالت کا سہارا لیکر مسترد بھی فرما دیتے ہیں، اس کتاب کے بعض مندرجات پر قیل و قال کی گنجائش ضرور ہے کہیں کہیں بیجا تاویل اور خوردہ گیری سے بھی کام لیا ہے، بعض مباحث میں تکرار اور غیر ضروری طوالت بھی ہے تاہم مولانا مودودی نے حضرت عثمانؓ و امیر معاویہؓ کی شخصیت کو مجروح کرنے والی تاریخی روایتوں کو جس انداز سے نمایاں کیا ہے اس کتاب سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۷ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۱ء عدد ۶

مضامین

شذرات

معارف کے شذرات میں گذشتہ چودہ سو سال ہجری کے اندر اچھے مسلمان حکمرانوں میں، بنوامیہ کے بعد کچھ عباسی، سلجوقی، زنگی اور ایوبی فرمانرواؤں کا ذکر آیا تھا، اندلس میں مسلمانوں کی بڑی شاندار حکومت رہی، اس پر بھی ایک نظر پڑ جائے تو اچھا ہے۔

یہاں مسلمانوں کا داخل ہونا اور وہاں سے ان کا خارج ہونا، دونوں کی تاریخ ولولہ انگیز ہونے کے ساتھ عبرتناک بھی ہے، اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں طارق بن زیاد جبرالٹر میں اترا تو اس نے اپنی واپسی کے تخیل کو مٹانے کے لیے اپنے تمام جہازوں کو جلا دیا، جس کے بعد ان کے لیے یا تو موت تھی یا وہ زمین جہاں وہ اترے تھے، ان کی اولوالعزمی کو دیکھ کر ان کے دشمن یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ وہ زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اترے ہیں، اسپین کے بھاری بھرکم ہسپانی لشکر کے مقابلہ میں مسلمان فوجیوں کی تعداد بہت کم تھی، طارق نے ان میں جوش، ولولہ، عزم اور استقامت کی روح پھونکنے کے لیے اس وقت جو بڑی لمبی تقریر کی وہ آج بھی اس قابل ہے کہ مسلمان ملکوں کا ہر فوجی سپہ سالار اس کو حرز جان بنائے رکھے۔

اس لمبی تقریر کے خاص خاص ٹکڑے یہ ہیں: مسلمانو! سمجھ لو، میدان جنگ سے مفر کی اب کوئی صورت نہیں، سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہیں، خدا کی قسم پامردی اور استقلال ہی میں تمہاری نجات ہے، یہی فتح مند فوجیں ہیں جو مغلوب نہیں ہو سکتیں، تعداد کی قلت سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا، فوج کی کثرت ہو لیکن اس میں بزدلی، سستی، نامردی اور اختلاف ہو تو اس کی کثرت اس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتی، تمہاری تلواروں کے علاوہ تمہارے پاس کوئی سامان اور رسد نہیں ہے، تم کو اپنے دشمنوں سے سب کچھ چھین کر

لانا ہے، اگر تم نے کوتاہی کی اور کچھ حاصل نہ کیا تو تمہارے دشمنوں کے دلوں میں تمہارا رعب پیدا ہونے کے بجائے تم سے مقابلہ کی ہمت پیدا ہو جائے گی، تم اپنی جان پر کھیل جاؤ تو کامیابی تمہارے قدم چومنے کے لیے فرش راہ ہے، میں حملہ کروں تو تم بھی حملہ آور ہو، اگر میں رک جاؤں تو تم بھی رک جاؤ، جنگ کے وقت سب مل کر ایک جسم بن جاؤ، اگر میں اس جنگ میں مارا جاؤں تو تم غم نہ کرنا، میرے بعد آپس میں جھگڑا نہ کر بیٹھنا، خبردار ذلت پر راضی نہ ہونا، اپنے کو دشمن کے حوالے کسی حال میں نہ کرنا، خدا نے تمہاری مشقت اور جفاکشی کے ذریعہ دنیا میں تمہارے لیے جو عزت و شرف اور راحت اور آخرت میں جو ثواب مقدر کر رکھا ہے، اس کی طرف بڑھو، اور اگر تم نے یہ کر لیا تو اللہ کے سارے فضل و احسان تمہارے ساتھ ہیں، وہ تمہیں آیندہ ہونے والے بڑے گھاٹے اور کل مسلمانوں کے درمیان برے لفظوں سے یاد کیے جانے سے بچائے گا۔

اس تقریر کے بعد فوج ایسے عزم، ہمت اور جوش سے لڑی کہ اس کو زبردست فتح حاصل ہوئی، پھر دو برس کے اندر بحر شام سے لیکر کوہ پائرینز تک مسلمانوں کا تسلط ہو گیا، اس۔ پی اسکاٹ کا بیان ہے کہ جس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے اندلس پر کامل قبضہ کیا اور صدیوں اپنے ہاتھ میں رکھا، تاریخ عالم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، یہی مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ ملک پچاس برس کے اندر تہذیب کے اس نقطہ پر پہونچ گیا جہاں تک پوپ کی حکومت کے ماتحت اٹلی کو پہونچنے میں ایک ہزار برس لگے تھے۔

اس کا پہلا باضابطہ حکمراں عبدالرحمٰن الداخل تھا، دمشق میں بنوامیہ کو عباسیوں نے ختم کیا تو وہ وہاں سے فرار ہو کر اسپین پہونچا، جب وہ اس کے ساحل پر پہلی دفعہ اترا تو اس کے سامنے شراب پیش کی گئی، اس نے یہ کہہ کر اس کی طرف سے منھ موڑ لیا کہ اس کو تو ایسی چیز کی ضرورت ہے جو اس کی عقل کو بڑھائے نہ کہ اس کو کم کرے، اسی طرح ایک موقع پر اس کو بہت ہی حسین و جمیل کنیز پیش کی گئی، اس نے یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ اگر وہ اس کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور بنا لے گا تو اپنے اصلی مطلوب کو چھوڑ دیگا اور اگر اپنے اصلی مطلوب کی فکر میں برابر لگا رہا تو اس کنیز پر صریحاً ظلم ہوگا، ان ہی اوصاف کے ساتھ اس نے

ایک ایسی خاندانی حکومت کی ابتداء کی جس کی مثال اس وقت تک بقول یوروپین مصنفین یورپ میں نہیں دیکھی گئی۔

عبدالرحمٰن الداخل کے عزم، تدبر، دانائی اور اصابت رائے کی بڑی شہرت رہی، عوام کے لیے اس کا قصر کھلا رہتا، وہ ممالک محروسہ میں برابر دورے کرتا، حکام کے اعمال پر کڑی نظر رکھتا، رعایا کی ضروری باتوں سے باخبر رہتا، صنعت و حرفت کی ترقی کی ترغیب دلاتا، اس کی سرپرستی میں علوم و فنون کو بڑا فروغ ہوا، جہانبانی میں اس کی حیثیت وہی تھی جو بنو عباس میں منصور کی تھی، اس نے قرطبہ کو عمارتوں اور سیرگاہوں سے اس طرح سجا دیا تھا کہ خود وہ اس پر ناز کرنے لگا، اس نے مسجد قرطبہ کی بنیاد یہ کہہ کر ڈالی کہ اس کی شان و شوکت بہت جلد ایک خلیفہ مانگے گی، اس کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

عبدالرحمٰن الداخل کے بیٹے ہشام اول نے صرف ساڑھے سات سال تک حکومت کی، مگر اپنے سیرت و کردار اور رموز حکمرانی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی یاد تازہ کر دی، اس کے زمانہ میں قرطبہ علماء، فضلاء اور صلحاء کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا، اپنی وفات سے پہلے اپنے جانشین حکم کو یہ نصیحتیں کیں کہ عدل و انصاف میں امیر و غریب کا امتیاز نہ کرنا، جو لوگ تمہارے دست نگر ہیں ان سے لطف و کرم سے پیش آنا، یہ سب لوگ خداوند تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں، صوبوں اور شہروں کی حفاظت نمک حلال اور تجربہ کار لوگوں پر چھوڑنا، رعایا کو تنگ کرنے والے حکام کو بے رحم ہو کر سزا دینا، اپنے سپاہیوں سے اعتدال سے پیش آنا اور یہ خیال رکھنا کہ ان کو اسلحہ ملک کی حفاظت کے لیے نہ کہ تباہ کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں، ہمیشہ اس کی کوشش کرنا کہ تمہاری رعایا تم سے ڈرنے اور نفرت کرنے کے بجائے تم سے محبت کرے، اگر لوگ تم سے ڈرتے رہے تو وہ خطرناک ہو جائیں گے، اور نفرت کرتے رہے تو تم کو برباد کرنے کی کوشش کریں گے، کاشتکاروں کی پوری حفاظت کرنا کہ وہ روٹی مہیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، جہانبانی کے ان ہی اصولوں کا وہ خود بھی پابند رہا۔

اس خاندان کے حکمراں عبدالرحمٰن ثانی کا کردار یہ پہلو یہ تھا کہ وہ حسن پرست واقع ہوا تھا فنون لطیفہ کا

بھی بڑا دلدادہ رہا، مگر اسی کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند تھا، ایک مرتبہ رمضان میں اس کا ایک روزہ قضا ہو گیا تو ساٹھ دن کے روزے کفارہ میں رکھے، اس کی دینداری کی وجہ سے عوام بھی دیندار ہو گئے تھے، لوگ اس کی زندگی کی رنگینی کو اس کی طبیعت کی کمزوری اور اس کی دینداری کو اس کی زندگی کا جوہر سمجھتے، اس لیے اس کی کمزوری سے چشم پوشی کرتے، وہ سائنس، صنعت اور حرفت کا بڑا مربی تھا، یونانی فلسفہ سے اس کو بڑی دلچسپی رہی، قرطبہ کو عالی شان عمارتوں، حماموں، سیرگاہوں اور فواروں سے سجا کر بغداد ثانی بنا دیا تھا، اس کے عہد میں تہذیب و تمدن کو ایسا فروغ ہوا کہ یورپ کے فرمانروا اس کی نقل کرنا فخر سمجھتے تھے۔

عبدالرحمٰن ثانی کا جانشین امیر محمد ہوا، جس کا دور حکومت بڑا پر آشوب رہا، لیکن علماء اس کی دینداری کی وجہ سے اس کے گرویدہ رہے، وہ بہت بڑا شاعر، خطیب اور خطاط بھی تھا، اس کا جانشین المنذر ہوا جس کی حکومت دو سال تک رہی، مگر اس نے اپنے حزم، تیز فہمی اور شجاعت سے عیسائیوں پر جو فتوحات حاصل کیں، اس سے اس کی بڑی شہرت ہوئی۔

اس خاندان کا لائق ترین فرماں روا عبدالرحمٰن ثالث تھا، اس کے انتقال کے بعد اس کے کاغذوں میں ایک بیاض نکلی جس میں اس نے خود لکھا تھا کہ "میں نے نہایت امن اور کامیابی کے ساتھ پچاس برس حکمرانی کی، میری رعایا مجھ پر فدا تھی، میرے دشمن مجھ سے لرزاں تھے، میرے حلیف اور دوست مجھ سے خوش تھے، دنیا بھر کے بادشاہ میری دوستی کے طلبگار تھے، کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ جس کی خواہش انسان کے دل میں ہوا کرتی ہے وہ مجھ کو میسر نہ ہوئی ہو، شہرت، قوت اور عیش سب کچھ مجھے حاصل تھا، میں نے اس طویل زندگی میں ان دنوں کو گنا ہے جن میں بے فکر رہا ہوں اور مجھے حقیقی خوشی نصیب ہوئی، وہ شمار میں صرف چودہ تھے، کیا دنیا کا کوئی حکمراں اپنی حکمرانی میں یہ دعویٰ کر سکتا ہے،" اس نے الناصر لدین اللہ کا لقب بھی اختیار کر لیا تھا، اس کے بعد اس کے جانشین بھی ایسے القاب اختیار کرتے رہے

عبد الرحمٰن ثالث کے لڑکے حکم ثانی کے زمانہ میں حکومت سنبھلی رہی، جس میں علوم و فنون کو بڑا فروغ ہوا، اس کے بعد ہشام ثانی، المظفر اور مہدی وغیرہ تخت پر بیٹھے، مگر پھر طوائف الملوکی ایسی بڑھی کہ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی، مسلمان قرطبہ کو کھو کر غرناطہ میں سمٹ آئے، مگر یہاں بھی وہ متحد نہیں رہے، عیسائیوں نے ان کے نفاق و افتراق سے پورا فائدہ اٹھایا، وہ آٹھ سو برس کے بعد اندلس کو مسلمانوں سے خالی کرانے میں کامیاب ہوگئے، اسٹینلی لین پول اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حکومتیں بنتی ہیں، عروج حاصل کرکے ختم بھی ہو جاتی ہیں، یونان، روم اور دنیا کی بہت سی قدیم سلطنتیں جاتی رہیں، اسی طرح اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا، مگر اس کو دکھ ہے کہ اندلس سے مسلمانوں کو خالی کرا کے عیسائی یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، انھوں نے یورپ کے ایک زریں راج ہنس کو ہلاک کر دیا، اسپین مسلمانوں کی وجہ سے صدیوں تک تمدن، آرٹ، سائنس، علوم اور ہر قسم کی روشن خیالی کا مرکز بنا رہا، یورپ کا کوئی ملک اس معیار کو نہیں پہونچ سکا، مگر اس ملک میں ان کے بعد جو گہن لگا اس کی تاریکی آج تک دور نہیں ہو سکی ہے، لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے رومن امپائر کو ختم کیا تو عیسائیوں نے اس کا بدلہ اسپین میں لیا۔

اس. پی اسکاٹ نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کو اس ملک کو از سر نو فتح کرنے میں آٹھ سو برس متواتر جد و جہد کرنی اور پانچ ہزار لڑائیاں لڑنی پڑیں، ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت تک وہی قوم دوسرے ملک میں جا کر حکومت کر سکتی ہے جس کے فرمانروا زیادہ تر اچھے رہے ہوں، اندلس میں ایسے اچھے حکمرانوں کی تعداد زیادہ رہی، اسی لیے کہ اب تک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی۔

اس. پی اسکاٹ لکھتا ہے کہ عبد الرحمٰن ثالث نے رفاہ عام کے کام بڑے وسیع پیمانے پر انجام دیے، اور اپنے دور بادشاہت میں بڑی شان و شوکت پیدا کی، ایچ. ڈبلیو. کاکس رقمطراز ہے کہ المستنصر کے نام سے تمام عیسائی دنیا لرزہ بر اندام رہتی، ڈوزی لکھتا ہے کہ عبد الرحمٰن سوم کی فوج دنیا کی

بہترین فوج تھی، یورپ کے فرمانروا اس سے سفارتی تعلقات رکھنے میں فخر کرتے، اس کی رواداری کا یہ حال تھا کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو مشورے کے لیے بلاتا، وہ ازمنۂ وسطیٰ کے بجائے موجودہ دور کا فرماں روا ہونے کے لائق تھا، اڈربو کرچ ٹون رقمطراز ہے کہ حکم کے زمانہ میں عبد الرحمٰن سوم سے زیادہ حکومت کی شان و شوکت بڑھ گئی تھی، خصوصاً جب اس نے بربروں کے علاقہ پر قبضہ کر لیا، غرناطہ کے حکمراں محمد بن احمر کے بارہ میں اس. پی اسکاٹ لکھتا ہے کہ وہ نہایت قابل بادشاہوں میں سے تھا، اس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سخت پر آشوب زمانہ میں مسلمانوں کے دین کی عزت اور ان کی تلوار کی عظمت کو قائم رکھا

اسٹینلی لین پول اندلس میں مسلمانوں کی حکومت پر عام تبصرہ یہ لکھ کر کرتا ہے کہ عرب فاتحوں نے جس نرمی، عدل پروری اور دانشمندی سے اندلس پر حکومت کی اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی، یہاں کے باشندے اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے زمانے سے زیادہ خوش تھے، ان کو اپنے قوانین اور ججوں کو رکھنے کی اجازت تھی، ضلعوں میں ان ہی کے ہم مذہب حکام ہوتے، وہی ان سے ٹیکس وصول کرتے، وہی ان کے باہمی جھگڑے چکاتے، عیسائی حکومت کے زمانہ میں زبردستی مذہب کی تبدیلی کے لیے مجبور کیے جاتے، مسلمانوں نے ان پر کبھی ایسا دباؤ نہیں ڈالا، خود عیسائی علانیہ اعتراف کرتے کہ فرینکوں اور گوتھوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حکومت کہیں بہتر ہے۔

اس. پی اسکاٹ کا بیان ہے کہ تمام سائنٹیفک کاموں اور زندگی کے عملی امور میں اندلس کے مسلمان انتہائی علم و ہنر کے ساتھ اپنا کمال اور جوہر دکھلاتے رہے، صنعت کا کوئی میدان ان کے لیے تنگ نہ تھا، جزئیات کے مکتسبات کی تحقیق کے لیے ان کا میدان وسیع تھا، انھوں نے اپنی قوت عقلیہ اور مہارت تامہ سے ان چیزوں سے مفید کام لیا جو دوسری قوموں کے لوگ نہایت حقارت سے رد کرتے رہے ہیں، وہ یورپ پر تہذیب و تمدن کا مستقل نقش چھوڑ گئے ہیں، قرون وسطیٰ کے یورپ کے سیاہ نقشے پر اگر کوئی سفید اور روشن جگہ نظر آتی تھی

تو وہ اس زمانہ کا اندلس تھا، یورپ کی ضروریات اور ایشیا کے تعیشات کے لیے مسلمانانِ اندلس کی زراعت، کان کنی اور صنعت و حرفت سے ہر طرح کا سامان بہم پہنچتا رہا۔

قرطبہ، مدینۃ الزہراء، غرناطہ اور الحمراء وغیرہ کو ان مسلمانوں نے جس طرح سنوارا، اس سے یورپ والوں کی آنکھیں خیرہ رہیں، خود یوروپین مصنفین لکھتے ہیں کہ قرطبہ اپنی خوبصورتی اور دلکشی کی وجہ سے صحیح معنوں میں وادی الحسن، صراط الورد، اور جنان العجوبہ کہلانے کے لائق تھا، یہ دولت کا خزینہ، تجارت کا مرجعِ انام اور تمام یورپ کی سیاست کا عنان سمجھا جاتا تھا، صنعت و حرفت، سائنسی کمالات اور تہذیب و تمدن کے عروج میں فرانسیسی مورخ موسیو لیبان کے قول کے مطابق کوئی اور دار السلطنت مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس میں اٹھائیس سو (۲۸۰۰) مسجدیں، ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) محلات اور دلکش عمارتیں، دو لاکھ (۲۰۰۰۰۰) مکانات اور سات سو (۷۰۰) حمام تھے،

اس۔ پی اسکاٹ کے خیال میں مدینۃ الزہراء اپنی جائے وقوع اور تعمیری خوبصورتی کے اعتبار سے اتنا دلکش تھا کہ اور گیتی نے کوئی اور جگہ اس کے مقابل میں نہ دیکھی تھی اور نہ دیکھے گی۔

غرناطہ میں کھجور اور انار کے پہلو بہ پہلو آلو بالو اور لیمون بکثرت پیدا ہوتے، زیتون کے باغات اتنے تھے کہ سیاح انکو شاہ بلوط کے جنگل سے تشبیہ دیتے تھے، ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لیے شہتوت کے درخت ہوتے، ساحل کے نزدیک روئی اور کتان کی کاشت ہوتی، دواؤں کے پودوں کی کاشت بڑے سلیقہ سے کی جاتی، زمانۂ حال کے اطباء انہی پودوں کی بنائی ہوئی دواؤں سے یورپ میں علاج کر رہے ہیں، یہ ساری چیزیں عربوں کی وجہ سے وہاں رائج ہوئیں، پھر یہ شہر اپنی عمارتوں کی زنگاری کی وجہ سے ایسا ہو گیا تھا کہ شعرا اپنی زبان میں کہتے کہ معلوم ہوتا ہے کہ زمرد کے ساغر میں موتی جڑے ہوئے ہیں، یہاں کے محلات کا سرتاج الحمراء تھا، جس میں اندلس کے مسلمانوں کے صدیوں کا تمدن سمٹا ہوا نظر آتا تھا، اس کی حیرت انگیز رنگ آمیزی اور گل کاریوں کو دیکھ کر ایک فرانسیسی شاعر نے کہا تھا کہ اس قصرِ شاہی کو جنات نے آراستہ کیا اور اس کو ہر رنگ کی نغمہ سرائی کا گہوارہ بنا دیا، اور یہ ایک طلسماتی خواب دکھائی دیتا۔

اندلس میں علوم و فنون کے جو یگانۂ روزگار ماہرین پیدا ہوئے ان کی داستان الگ ہے۔

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۳)

سیر الصحابہ جلد ششم میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے حالات

امیر معاویہؓ کے بعد کربلا کا جو خونیں واقعہ پیش آیا تو اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ مکہ میں حرم کی پناہ میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد انھوں نے اہل تہامہ اور اہل حجاز کو اپنی بیعت کی دعوت دی، چند لوگوں کے علاوہ سبھوں نے بیعت کر لی، اس کے بعد یزید کے عمال کو مدینہ سے نکال دیا، یزید نے ان کے مقابلہ میں ایک فوج بھیجی جس نے خانۂ کعبہ پر بھی آتش باری کی، اور اس کی عمارت کو نقصان پہونچایا، مگر یزید کی یکایک وفات سے یہ فوج واپس ہو گئی، یزید کے بعد مروان اس کا جانشین ہوا، جس نے شام اور مصر سے ابن زبیرؓ کے حامیوں کو نکال دیا، مگر وہ بھی جلد مر گیا تو اس کے لڑکے عبد الملک کی تخت نشینی ہوئی، اسی انتشار کے زمانہ میں ثقیف کا ایک عالی دماغ شخص مختار ثقفی ابھرا، جس نے پہلے حضرت ابن زبیرؓ کے مزاج میں رسوخ پیدا کیا، پھر ان سے کٹ کر حضرت امام حسینؓ کے سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہ کا سرپرست بن گیا اور قاتلین حسینؓ سے بدلہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا جس سے اس کی مقبولیت بڑھی، وہ عراق پر قابض ہو گیا اور حضرت حسینؓ کے قاتلوں شمر ذی الجوشن، خولی اصبحی اور عمر بن سعد کو قتل کر کے ان کے سر محمد بن حنفیہ کے پاس بھجوا دیے، مگر کچھ دنوں بعد کوفی عربوں نے مختار ثقفی کی مخالفت شروع کر دی، ان کو یقین ہو گیا کہ وہ بنی ہاشم کے پردہ میں اپنی دنیا بنانا چاہتا ہے،

بالآخر وہ ایک لڑائی میں مارا گیا، محمد بن حنفیہ کا کوئی پشت پناہ باقی نہ رہا، حضرت ابن زبیرؓ نے ان سے بیعت کا مطالبہ کیا، لیکن انھوں نے بیعت سے انکار کیا اور وہ طائف جاکر پناہ گزین ہوئے، مختار کے قتل کے بعد حضرت ابن زبیرؓ کی قوت بڑھ گئی اور ان کا قبضہ مختار کے مقبوضہ علاقوں پر بھی ہو گیا، مگر ان کا مقابلہ عبد الملک سے ہوا، تو عبد الملک نے حجاج کی نگرانی میں فوج بھیج کر حرم کا محاصرہ کرا دیا، ابن زبیرؓ نہایت دلیری اور پامردی کے ساتھ مدافعت کرتے رہے، مگر جب رسد کی کمی ہو گئی اور ان کے ساتھیوں نے بے وفائی کرنی شروع کی تو وہ اپنی والدہ کے پاس پہونچے اور ان سے مشورے طلب کیے، ماں بیٹے کی جو گفتگو ہوئی وہ اسلام کی تاریخ کا طرازریں اور ولولہ انگیز واقعہ ہے، اس کو شاہ صاحبؒ نے جس موثر طریقہ سے بیان کیا ہے، وہ ان ہی کی تحریر کے ذریعہ سے سننے کے لائق ہے:

"ابن زبیرؓ نے اپنی بے بسی کا عالم دیکھا تو مایوس ہو کر ایک دن اپنی ماں حضرت اسماءؓ کی خدمت میں عرض کیا: اماں! میرے تمام ساتھیوں نے ایک ایک کرکے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے، حتیٰ کہ میرے لڑکے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اب صرف چند فداکار باقی رہ گئے ہیں، لیکن ان میں بھی مقابلہ کی تاب نہیں، اور ہمارا دشمن ہمارے منشا کے مطابق مطالبات پورا کرنے پر آمادہ ہے، ایسی حالت میں آپ کیا فرماتی ہیں؟"

اس وقت ان کی ماں حضرت اسماءؓ کی عمر سو برس سے متجاوز ہو چکی تھی، کئی جوان بیٹوں اور پوتوں کے داغ اٹھا چکی تھیں، دل و جگر داغدار تھے، نامور بیٹوں میں صرف عبد اللہؓ باقی تھے، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اس پیرانہ سالی اور ایسی خستہ دلی کے ہوتے ہوئے بھی صدیق اکبرؓ کی اولوالعزم اور بہادر بیٹی نے آمادہ بہ قتل بیٹے کو جو شریفانہ جواب دیا اس پر عورتوں کی تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، فرمایا: بیٹا! تم کو خود اپنی حالت کا صحیح اندازہ ہوگا، اگر تم کو اس کا یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور حق کی دعوت دیتے ہو، تو جاؤ اس کے لیے لڑو کہ تمہارے بہت سے ساتھیوں نے بھی جان دی ہے، لیکن اگر تمہارا مقصد دنیا طلبی ہے تو تم سے بڑھ کر برا کون خدا کا بندہ ہوگا کہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ہلاک کیا، اگر یہ عذر ہے کہ تم حق پر ہو لیکن اپنے اعوان و انصار کی کمزوری سے لاچار ہو گئے ہو تو یاد رکھو شریفوں اور دین داروں کا یہ شیوہ نہیں ہے، تم کو کب تک دنیا میں رہنا ہے، جاؤ، حق پر جان دے دینا زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

ماں کی زبان سے یہ بہادرانہ جواب سن کر حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے کہا: اماں! مجھے صرف اس کا خوف ہے کہ اگر بنو امیہ میرے قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میری لاش کو مثلہ کرکے سولی پر لٹکائیں گے، اور اس کی بے حرمتی کریں گے، بہادر ماں نے جواب دیا:

"بیٹا! ذبح ہونے کے بعد بکری کو کھال کھینچنے سے تکلیف نہیں ہوتی، جاؤ خدا سے مدد مانگ کر اپنا کام پورا کرو۔"

یہ حوصلہ افزا باتیں سن کر حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی ڈھارس بندھی، ماں کے سر کا بوسہ دے کر بولے:

"میں نے یہ صفائی اپنے نفس کی کمزوریوں سے مبرا دکھانے کے لیے نہیں پیش کی، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو یہ تسکین رہے کہ آپ کے لڑکے نے ناحق بات کے لیے جان نہیں دی۔"

ماں نے جواب دیا:

"مجھے امید ہے کہ میں ہر حالت میں صبر و شکر سے کام لوں گی، اگر تم مجھ سے پہلے دنیا سے چل بسے تو صبر کروں گی، اور اگر کامیاب ہوئے تو تمہاری کامیابی پر خوش ہوں گی، اچھا جاؤ! دیکھوں خدا کیا انجام دکھاتا ہے۔"

اس کے بعد ماں نے ان کے حق میں دعا کرکے انھیں خدا کے سپرد کیا، پھر اپنے لیے صبر و شکر کی دعا مانگی، دعا مانگ کر بیٹے کو گلے لگا کر بوسہ دیا، اور جب یہ کہہ رہی تھیں کہ جاؤ اپنا کام پورا کرو تو گلے لگانے میں ان کی زرہ پر ہاتھ پڑ گیا، پوچھا:

"بیٹا یہ کیا؟ جان دینے والوں کا یہ شیوہ نہیں ہے۔"

ماں کے اس فرمان پر زرہ اتار دی اور رجز پڑھتے ہوئے رزمگاہ میں پہونچے اور قریش کا یہ یگانہ بہادر، حواریٔ رسولؐ کا لخت جگر اور ذات النطاقین کا نور نظر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، حجاج نے آتش انتقام میں ان کی لاش کو قریش کی عبرت کے لیے بیرون شہر ایک بلند مقام پر سولی پر لٹکوا دیا، کچھ دنوں کے بعد سولی سے اتروا کر یہودیوں کے قبرستان میں پھینکوا دیا، پھر وہ ان کی ماں کو طرح طرح کی دھمکیاں دے کر ان کے پاس پہونچا، اور بولا: سچ کہنا خدا نے اپنے دشمن کو کیا انجام دکھایا، دلیر خاتون نے جواب میں جہاں اس سے اور باتیں کیں وہاں یہ بھی کہا کہ تو نے ان کی دنیا خراب کی لیکن انھوں نے تیری آخرت برباد کی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بنی ثقیف میں کذاب اور مبیر ہوں گے، کذاب تو ہم لوگوں نے دیکھ لیا تھا مبیر باقی رہ گیا تھا، وہ تو ہے:

یہ داستان اس صحابی کی ہے جس کے متعلق شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ عثمان بن طلحہ کہتے تھے کہ تین چیزوں میں ابن زبیرؓ کا کوئی حریف نہیں، عبادت، بلاغت اور شجاعت، شاہ صاحبؒ نے ان کے ان تمام اوصاف کی بڑی جیتی جاگتی تصویر اپنی اس کتاب میں کھینچی ہے، جس سے اس زمانہ کی پوری تاریخ بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے، اس کو پڑھتے وقت یہ خیال غالب رہتا ہے کہ اس دور کی خونریزی کے بجائے مسلمان مسلمان بن کر ایک دوسرے کے لیے صلح و آشتی اور محبت و یگانگت کے پیامبر بنے رہتے تو آج ان کی تاریخ کیا سے کیا ہوتی، خود شاہ صاحبؒ کو بھی اس کا بڑا دکھ رہا، بڑے درد کے ساتھ لکھتے ہیں:

"حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور تک مسلمانوں کا شیرازہ بندھا ہوا تھا، ان کی تمام قوتیں غیر مسلموں کے مقابلہ میں صرف ہوتی تھیں، اس لیے جدھر رخ کرتے تھے، فتح و نصرت قدم چوم لیتی تھی، لیکن چند ہی برسوں میں دفعتہً حالات بدل گئے، اور مسلمانوں میں ایسا تفرقہ پیدا ہوا کہ پھر ان کی شیرازہ بندی نہ ہوسکی" (ص ۲۵۶)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے حالات میں اس تفرقہ کی پوری تفصیل شاہ صاحبؒ نے عبرت انگیز اور سبق آموز انداز میں پیش کردی ہے، جس میں ان کے قلم نے ان کی بڑی مدد کی۔

سیر الصحابہ جلد ہفتم

سیر الصحابہ جلد ششم کی اشاعت کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۳۲ء میں شاہ صاحبؒ کی سیر الصحابہ جلد ہفتم شایع ہوئی، جس میں ایک سو پچاس (۱۵۰) صحابہؓ کے حالات ہیں، مگر وہ مختصر ہیں، اسی لیے ان کے حالات کے قلمبند کرنے میں شاہ صاحبؒ کے قلم کا وہ زور نہیں دکھائی دیتا ہے جو ان کی گذشتہ جلدوں میں دکھائی دیتا ہے، اس کی وجہ خود انھوں نے یہ بتائی ہے کہ ان کے حالات، حدیث اور طبقات کی کتابوں میں محض برائے نام ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صحابہؓ ایسے وقت کے مسلمان یا پیدا شدہ ہیں، جبکہ عہد رسالت اور تبلیغ اسلام کا نازک اور ابتدائی دور جو آزمائش و امتحان کا حقیقی دور تھا، گذر چکا تھا، اس لیے انھیں صحابہؓ کی صف اول میں جگہ نہ مل سکی، اس کے علاوہ تاخیر اسلام اور صغر سنی کی وجہ سے انھیں فیضان نبوت سے استفادہ کا بھی پورا موقع نہ مل سکا، اسی لیے ان میں وہ روح نہ پیدا ہوسکی، جو مہاجرین و انصار کا طغرائے امتیاز ہے، لیکن ان کے حالات کا لکھنا اس لیے ضروری تھا کہ سلسلۂ سیر الصحابہ میں اخلاقی درس کے ساتھ عصر صحابہؓ کی پوری تاریخ بھی مسلمانوں کے سامنے آجائے، ان کے حالات مختصر ضرور ہیں، لیکن بقول شاہ صاحبؒ نکہت بیزی کے لیے مشک خالص کا ایک ذرہ بھی کافی ہوتا ہے، اور متلاشیان راہ حقیقت کے لیے تاروں کی روشنی بھی شمع ہدایت کا کام دیتی ہے (دیباچہ ص ۸)

شاہ صاحبؒ اس کتاب کے لکھنے میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ حضرت سید صاحبؒ نے حسن خاتمہ کے عنوان سے اس کے آغاز میں یہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج سے پندرہ (۱۵) سال پیشتر سیر الصحابہ کے نام سے جس سلسلہ کا آغاز کیا گیا تھا اس جلد پر آج بحمد اللہ اس کا خاتمہ ہوتا ہے، اس سلسلہ میں دس جلدیں دار المصنفین سے شایع ہوئیں، جن میں سے تین جلدوں کے لکھنے کی سعادت شاہ صاحبؒ کو حاصل ہوئی، اور انہی کی آخری جلد پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔

شاہ صاحبؒ کے ایک مضمون کا اچھا اثر

پہلے ذکر آیا ہے کہ رسالہ نگار میں حضرت ابوہریرہؓ پر جو گستاخانہ مضمون شائع ہوا تھا، شاہ صاحبؒ نے اس کا مدلل جواب مئی ۱۹۳۱ء کے معارف میں دیا، اس گستاخانہ مضمون کے لکھنے والے سید مقبول احمد تھے، جو اس زمانہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کو اسی قسم کے مضامین لکھنے میں لذت محسوس ہوتی تھی، شاہ صاحبؒ کے مضمون کی اشاعت کے بعد ان پر یورش ہوئی تو انھوں نے اپنی ایک تحریر میں باضابطہ اعلان کیا کہ میرا تعلق نگار اور اس کے الحادی مضامین سے ہرگز نہیں، ہاں حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق میری تنقید و جرح میں مجھے ایک سخت غلطی کا اشتباہ ہوا، اور میرا یہ اسلامی فرض ہے کہ بہت جلد اپنی رائے کا اظہار کر کے اس سے قطعی رجعت کرلوں، اور میں اس کو کسی دنیاوی خوف سے نہیں لکھ رہا ہوں، حضرت ابوہریرہؓ کے خلاف امام رازی، شعرانی، ازرقی اور صحابہؓ میں ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی نسبت سکوت کرتا ہوں، اس پر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے معارف کے شذرات میں تحریر فرمایا ہے کہ ایسے عالم نما جہلاء کے شوق نمایش کے فرو کرنے کے لیے ضروری تھا کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ فریبِ نفس کے جس طلسم میں وہ اب تک مبتلا تھے وہ کہاں تک اصلیت رکھتا تھا، مگر حضرت سید صاحب نے اس کی ذمہ داری علماء پر بھی رکھی جن کے بارہ میں تحریر فرمایا کہ وہ اپنے وعظ و پند کے لیے متشککین کی اس جماعت کو چھوڑ کر صرف عوام کو منتخب کرلیا ہے اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان متشککین کی بیماری ناقابل علاج ہے، وہ نہ کبھی ان کے خیالات کو سنتے اور نہ ان کے شکوک کو دور کرتے ہیں، اور کبھی وہ ان کی طرف توجہ بھی کرتے ہیں تو ایسی زبان اور طریقۂ ادا اور اسلوب بیان میں اپنا مدعا ظاہر کرتے ہیں کہ متکلم و مخاطب دونوں کو ایک دوسرے سے گھبراہٹ ہوتی ہے (شذرات معارف نمبر ۵ جلد ۲۸) سید صاحبؒ نے اسی بات کو سامنے رکھ کر شاہ صاحبؒ کو ان متشککین کے خلاف میدان میں اتارا، جس میں اتر کر انھوں نے مردانہ وار جنگ کی، اور وہ زبان، طریقۂ ادا اور اسلوب بیان اختیار کیا جو سید صاحب چاہتے تھے، اسی لیے ڈپٹی مقبول احمد نے سپر ڈال دی۔

اوقات نماز پر ایک اہم مضمون

ڈپٹی مقبول احمد نے معافی تو ضرور مانگ لی، مگر اس سے پہلے نگار میں جس کو شاہ صاحبؒ نے

فتنہ پردازانِ علم و مذہب کا مشہور آرگن قرار دیا، ان کا ایک اور مضمون "نقاب پوش حق گو" کے نام سے چھپ چکا تھا، جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ قرآن پاک میں ظہر اور مغرب کا کوئی ذکر نہیں، در حقیقت ظہر اور مغرب کا کوئی وقت بھی نہیں، بلکہ یہ دونوں اوقات عصر و عشاء کی تقدیم و تاخیر سے پیدا ہوئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی عشاء کی نماز جلدی پڑھ لی اور کبھی دیر کرکے، اسی طرح عصر کی نماز کبھی دن ڈھلنے کے اول وقت پڑھ لی، کبھی دن ڈھلنے کے آخر وقت، دیکھنے والے یہ سمجھے کہ آپ نے علٰحدہ علٰحدہ دو اوقات کی نماز ادا کی، آپ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کثرت سے باجماعت پڑھتے تھے، لوگوں نے انکو بھی مستقل فرض نماز شمار کرلیا، صحابہؓ کے عہد میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کے اوقات ایک دوسرے کے معنیٰ میں سمجھے جاتے تھے، ابن عباسؓ کی روایت جمع بین الصلوٰتین سے اس کی تائید ہوتی ہے، حدیث سے ظہر اور مغرب کی نمازوں کا ثبوت نہیں ملتا، خارجی جو صحیح مسلمان تھے وہ تین ہی وقت کی نماز پڑھتے تھے، پانچ وقت کی نماز مجوسیوں کی نقل ہے۔

اس قسم کے مذہبی ہفوات کی تائید نگار کے مدیر نے اپنے ملاحظات میں یہ لکھ کر کی کہ ہمارے مولوی بالکل ٹھوس اور جامد ہیں، علمائے مغرب کی طرح اپنے دماغ سے کوئی اختراع نہیں کرتے، اور اگر کوئی روشن دماغ اور روشن ضمیر موجد و مخترع ذہن و دماغ کی تربیت کے لیے کوئی جدید تحقیقات اور نئی ایجاد پیش کرتا ہے تو مولوی کفر کا فتویٰ دے کر سوسائٹی سے خارج کر دیتے ہیں، تنقید حدیث، اوقات صلوٰۃ، ایام صیام، اور قتل مرتد کی نئی تفسیروں میں علمائے جدید کی ہم نوائی نہیں کرتے۔

اس تکلیف دہ مضمون کو ایک دیوانے کی بکواس سمجھ کر نظرانداز کرنے کی ضرورت تھی، لیکن استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی ایمانی حرارت بروئے کار آئی اور انھوں نے اپنے لائق شاگرد جناب شاہ صاحبؒ سے اس کا جواب پھر لکھوایا جو حضرت سید صاحب کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے نومبر ۱۹۳۱ء کے معارف کے اٹھاون (۵۸) صفحے اس کے لیے مخصوص کیے اور اس میں کوئی اور مضمون شائع نہیں کیا۔

شاہ صاحبؒ نے کلام پاک، حدیث، تاریخ تدوین حدیث، صحابۂ کرامؓ کے اقوال اور جمہور مسلمین کے بلا اختلاف عمل سے بڑے فاضلانہ انداز میں اس پورے مضمون کو شروع سے آخر تک کذب و دروغ، اور تحریف و تدلیس کا ایک دفتر قرار دیا، اس کے لکھنے میں ان کا انداز جہاں محققانہ اور عالمانہ تھا، وہاں ان کے ناقدانہ اسلوب میں زہریلا رنگ بھی پیدا ہوگیا، حضرت سید صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب کوئی اللہ، اس کے رسولؐ، کلام پاک اور احادیث پر حملہ آور ہوتا ہے تو پھر اس کے جواب میں ان کی تحریر ایسی زہریلی ہوجاتی کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کی زہرناکی کو نہیں دھو سکتا ہے، مذکورۂ بالا مضمون میں دین اسلام کے مخترع شارح نے اس کی جس طرح بیخ کنی کی کوشش کی، اس سے اپنے محترم استاذ کی طرح شاہ صاحبؒ کی رگِ حمیت کا پھڑکنا ضروری تھا، انھوں نے اس کے جواب میں نگار کے مدیر اور اس کے مضمون نگار کی خبر جس طرح لی ہے اس میں ناگزیر زہرناکی بھی ہے، مدیر نگار نے مولویوں کو جامد اور اپنے مضمون نگار کی جدید تحقیقات کو اختراع قرار دیا تھا، اس پر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"سبحان اللہ! کتنی صحیح منطق ہے، کیا اختراع و ایجاد کے لیے صرف مذہب ہی کا میدان رہ گیا ہے اور مذہب کی نئی تفسیروں ہی کا نام اختراع ہے اور ان ہی اختراعات کو قبول نہ کرنے سے مسلمان تباہ و برباد ہوجائیں گے، کیا صرف دس ہی دن کے روزوں اور تین ہی وقت کی نماز میں ان کی ساری ترقیاں منحصر ہیں، کیا مسلمان اس لیے پستی میں ہیں کہ وہ پانچ وقت کی نمازیں پڑھتے اور مہینہ بھر کے روزے رکھتے ہیں، اور اگر اس کے بجائے دس دن کے روزے رکھنے لگیں اور تین وقت کی نمازیں پڑھنے لگیں تو ترقی کے اوج کمال پر پہونچ جائیں گے، تنزل اور ترقی کی یہ نئی تعبیر بھی اس عہد کی وہ عجیب و غریب اختراع ہے کہ اس پر علمائے مغرب بھی حیران رہ جائیں گے، ناظرین ان اختراعات کو پڑھیں، اور جامد مولوی کی نہیں بلکہ مخترع اعظم کی فہم کا ماتم کریں، کاش انھوں نے کوئی نیا ستارہ دریافت کیا ہوتا، کسی نئے کیمیاوی عنصر کا پتہ لگایا ہوتا، کسی قطب کی سیر

کی ہوتی، پھر دیکھتے کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگتا ہے یا ان کے کمال کی داد دی جاتی ہے، اس میدان میں تو پائے لنگ کا عذر ہے، اور مذہب کی تحقیق کے لیے ہر لنگڑا بادِ صبا کے دوش مرکب پر سوار نظر آتا ہے، جن موٹی موٹی کتابوں کے لکھنے کا ہم پر طعنہ کیا جاتا ہے آج انہی کی بدولت یہ علم کی فراوانی ان کے کاشانہ میں نظر آتی ہے، اور اسی کے دستبرد سے آج وہ علم سے بہرہ مند ہونے کے مدعی ہیں، جو اس سے بالکل تہی دامن ہیں، ہدیۂ سعیدیہ اور شرح چغمینی کا نام لینا آسان ہے، گو ان کا ایک صفحہ دیکھنا بھی کبھی نصیب نہ ہوا ہو، اور سمجھنا تو بڑی بات ہے"۔

مدیر نگار کی مسروقہ تحریروں سے جو ناظرین واقف ہوں گے، وہ شاہ صاحبؒ کے اس طنز سے لطف لیں گے:

"بہر حال مذہب کی ان نئی تفسیروں کا جہاں تک تعلق ہے، واقف کار کی نظر میں وہ بھی ان مصلحین امت کے فضل و کمال کی ممنون نہیں، بلکہ تمام تر یورپین مصنفین کی صدائے بازگشت ہے، البتہ ہمارا موجد از قسم ادب لطیف یعنی شبابیات و عریانیات وغیرہ اپنے اختراعات میں پیش کر سکتا ہے، لیکن اس کے متعلق بھی عرض ہے کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست"

پھر مدیر نگار ہی کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"اس دور حریت میں زبان و قلم پر کوئی احتساب نہیں ع جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج"۔

شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید اور احادیث سے تمام دلائل پیش کرتے ہوئے مضمون نگار کے مبلغ علم کو ظاہر کرنے کے لیے اس کو سخن فہم مخترع اعظم، فاضل محقق، منطقی، ناقد، فاضل مجتہد، نامور مورخ اور حریت نواز وغیرہ کہہ کر طنز کیا، اور پھر جا بجا اپنی زہریلی تحریروں سے اس کو مجروح کیا، مثلاً:

"ہمارا فاضل محقق جب تک قیاسی گھوڑے دوڑاتا ہے اور دوسرے کے مال کو اپنا کہہ کر پیش کرتا ہے اس وقت تک کچھ نہ کچھ اس کی اصلی حقیقت کا پردہ ڈھکا رہتا ہے، اگر قرآن و حدیث کے متا،

ومقصد کو نہیں سمجھتا اور اس کی غلط تفسیر پیش کرتا ہے تو بھی چنداں قابل الزام نہیں کہ اس کے لیے علوم اسلامیہ میں مہارت کی ضرورت ہے اور محض عربی کی ابجد سے قرآن وحدیث کا فہم وتدبر مشکل ہے، لیکن جب وہ قیاس کی ہوائی فضا سے آگے بڑھ کر تاریخ کے معمولی واقعات کی دنیا میں اتر آئے تو اس کے فضل وکمال کا پردہ پورا فاش ہو جاتا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"تاریخ اسلام کا یہ نامور مورخ لکھتا ہے کہ وان کریمر کا خیال ہے کہ ابن عباسؓ نے امام حسنؓ اور ابن زبیرؓ کے خلاف بنی امیہ کے ساتھ مل کر سازش کی تھی، یہ لکھ کر نہایت عالمانہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے کہ میں اس قیاس کو صحیح نہیں سمجھتا، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تاریخ اسلام کے بارہ میں بالخصوص ایک بڑے صحابی کے مقابلہ میں ایک متعصب یوروپین کی شہادت معتبر نہیں ہو سکتی، بلکہ اس لیے کہ بنی امیہ کے دربار میں ابن عباسؓ کی رسائی کبھی نہیں ہوئی، اس سے پوچھا جائے کہ جب اس بیہودہ قیاس کو غلط سمجھتا تھا تو اس نے اپنے قلم کو کیوں اس سے آلودہ کیا ہے؟ لیکن وہ اپنی فطرت شتم صحابہ سے مجبور ہے۔"

پھر وہ لکھتے ہیں کہ فاضل علام کی تاریخ دانی کا یہ حال ہے کہ انھیں ابن عباسؓ اور بنی عباس کا فرق نہیں معلوم، بنی عباس کنھیں کہا جاتا ہے اور ابن عباسؓ سے کون مراد ہوتا ہے، "تاریخ اسلام میں دولت عباسیہ کے لیے ابن عباسؓ نہیں بلکہ بنی عباس استعمال کیا جاتا ہے، ابن عباسؓ سے مراد حضرت عبداللہؓ بن عباس کی ذات ہے، اور معلوم نہیں یہ کس فاضل محقق کی تحقیق ہے کہ بنی عباس کے زمانہ میں حدیث گوئی کے مرض نے ترقی کی، ناقد کو معلوم ہونا چاہیے کہ اشاعت حدیث کا اصل زمانہ خلفائے راشدین اور بنی امیہ کا تھا کہ تمام بڑے بڑے حفاظ حدیث صحابہؓ انہی دونوں زمانہ میں تھے۔"

اور آخر میں شاہ صاحب کا لب ولہجہ اور بھی تیز ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

"یہ ننگ اسلام قرآن، احادیث، اسوۂ رسولؐ اور عمل صحابہؓ کی تکذیب وتردید یوروپین مستشرقین کے گمراہ کن بیانات سے کرتا ہے، تاریخی حیثیت سے بھی ان خرافات کی کوئی حیثیت نہیں، وہ ان بیانات کے ثبوت میں اسلامی تاریخ سے کوئی ضعیف سے ضعیف سند بھی پیش کر سکتا ہے؟ یا محض مستشرقین یورپ کی متعصبانہ تحریروں سے نماز کی فرضیت اور عدم فرضیت کا فیصلہ ہو جائیگا، اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حرف بھی تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں، وہ بتائے کہ عہد نبوت یا عہد خلافت میں کب تک تین وقتوں کی نمازیں ادا کی جاتی تھیں، اور کب زنادقہ اور مانویہ کے اثر سے پانچ وقت کی ہوئیں، کیا اس عظیم الشان تغیر کی کوئی تاریخ دنیا میں موجود نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس بے بنیاد دعویٰ کے لیے کیا ثبوت اس کے پاس ہے۔"

شاہ صاحبؒ کے اس مدلل مضمون کے بعد نگار کے مضمون کی حیثیت بے سروپا خرافات ہی کی سمجھی گئی اور نہ صرف مضمون نگار بلکہ نگار کے مدیر مسلمانوں کی نظر میں مطعون رہے۔

جگر مرادآبادی کی شاعری پر ایک اہم مضمون

شاہ صاحبؒ نے نومبر، دسمبر ۱۹۳۲ء کے معارف میں جگر مرادآبادی کے مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" پر ایک بہت ہی عمدہ مضمون لکھ کر اپنے قلم کی ادبی گل کاری کا نمونہ دکھایا۔

اعظم گڈھ سے جگر مرادآبادی کا تعلق بڑا گہرا رہا، اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اعظم گڈھ ہی کے افق سے ایک بہت ہی دل آویز غزل گو کی حیثیت سے ابھرے، بلکہ بقول شاہ صاحبؒ ان کی شہرت نے یہیں پر پرواز لگائے، وہ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ یہاں بی۔ان۔بجل کی عینکوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے آتے تھے، ایک محلہ کے لوگوں کو اپنی غزلیں تفریحاً سناتے، تو اس زمانہ میں یہاں کے مشہور وکیل جناب مرزا احسان احمد کی نظریں ان کی طرف اٹھیں، وہ وکالت ضرور کرتے تھے مگر طبعاً ایک اچھے شاعر، ایک اچھے ادیب اور ایک اچھے نقاد تھے، جگر کی شاعری سے متاثر ہوئے تو جنوری ۱۹۲۰ء کے

رسالہ 'مخزن' لاہور میں ان پر ایک مضمون لکھا، اور ان کی شاعری کو اہالیان لکھنؤ اور دہلی کے لیے خوانِ ادب کہا، پھر ان کو جگرؔ کے دیوان کی ترتیب و اشاعت کا خیال پیدا ہوا، اگرچہ ان کی لاپروائی سے ان کی غزلیات کا ایک معتدبہ ذخیرہ تلف ہوچکا تھا، تاہم جو کچھ سرمایہ حاصل ہوسکا اس کا ایک گلدستہ بناکر مرزا احسان احمد صاحب نے 'داغ جگر' کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شایع کیا، اس میں ان کا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں جگرؔ صاحب کے حالات کے ساتھ ان کی شاعری کے جوش بیان' وسعت تخیل، جذبات نگاری، نکتہ آفرینی، سوز و اثر اور جدت ادا وغیرہ پر بڑا پُر مغز تبصرہ ہے، مرزا احسان احمد نے اس وقت لکھا کہ جگرؔ نے اپنی قوت تخیل کو ایک پیکر اعجاز بنادیا ہے، ان کا ایک ایک حرف جوشِ محبت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے' بلکہ ان کا ایک ایک شعر اسرار فطرت کا ایک متقفل خزانہ ہے، اس کی ایک ایک ادا عشق کی مستانہ کیفیتوں سے لبریز ہے، پھر تعجب کا اظہار کیا کہ ادبی دنیا اب تک ان کی حقیقی شاعرانہ عظمت سے ناآشنا ہے۔

جب مرزا احسان احمد کی تحریروں سے ادبی دنیا جگرؔ کی شاعرانہ عظمت سے آشنا ہوئی تو وہ مرزا احسان احمد کے بارِ احسان سے جھکے رہتے، وہ جب اعظم گڈھ آتے تو ان سے بڑی مخلصانہ محبت کے ساتھ ملتے، ان سے جگرؔ کی عقیدت کا اظہار اس شعر سے بھی ہوگا ؎

میں جگرؔ لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ مگر
دل ہر اک حال میں ہے حضرت احساں کے قریب

مرزا احسان احمد ہی کے حسن وساطت سے وہ جناب اقبال سہیل سے بھی ملنے گئے، شعر و ادب میں ان کی استادانہ مہارت اور امعان نظر کے قائل ہوتے گئے، مرزا احسان احمد ہی ان کو دارالمصنفین لائے، خود حضرت سید صاحب ان کے کلام سے متاثر ہوتے، ان کی غزلوں کو معارف میں چھاپنے لگے، اور ان کی سُرخی خونِ جگر رکھتے، اس طرح انھوں نے بھی ان کو اچھالنے کی کوشش کی جس کے بعد وہ منظر عام پر آئے، اور جب جگرؔ نے اپنا کلام 'شعلۂ طور' کے نام سے مرتب کیا تو سید صاحب سے اس پر

تعارف لکھنے کی درخواست کی، جناب مرزا احسان احمد نے اس کی تائید کی، سید صاحبؒ نے اس پر لکھنا شروع کیا تو پھر ان کے قلم سے ادب کے آبدار موتی جھڑ کر جھلملانے لگے، اور یہ تحریر ان کے ادب و انشاء کی رعنائی اور دلآویزی کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کے پڑھنے سے قارئین کو نثر منظوم کا لطف آئے گا، رقمطراز ہیں:

"جگرؔ کی شاعری میں زلف و شانہ ہے نہ سرمۂ و آئینہ' نہ ہوس بالائے بام' نہ شکایت منظر عام، نہ اس کے کاشانۂ خیال میں چشم ہائے بسمل کی آئینہ بندی ہے، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچہ میں شہداء کے دل و جگر کی گل کاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہیں اٹھا سکتا' وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا، اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب دکھائی دیتی ہیں تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے، مگر وہ تصویر نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوجاتی ہے۔"

آگے چل کر مے خوار اور جام و مینا میں سرشار جگرؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

"جگرؔ مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے' اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو' اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے بے خود و فراموش ہوکر بزم ساقیٔ کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے، جگرؔ بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پُر خمار مگر اس کا دل ہشیار ہے' اور کیا عجب کہ خود جگرؔ کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو' اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں یہ اثر نہ ہو۔"

سید صاحبؒ نے اپنی مذکورہ بالا تحریر کے دوسرے ٹکڑے میں رند اور سرمست جگرؔ سے متعلق جو رائے ظاہر کی اس پر بعض حلقوں میں چہ میگوئیاں اور نکتہ چینیاں بھی ہوتی رہیں لیکن انھوں نے اپنی اس رائے میں

کوئی ترمیم نہیں کی، اس تعارف کو اپنی کتاب نقوش سلیمانی میں اسی طرح شایع کیا، جگر کی آخری زندگی میں جو انقلاب آیا، انھوں نے جس سرشارانہ انداز میں حج کیا، اور مدینہ منورہ میں حاضری دی، پھر جو پرکیف نعتیں کہیں اور اپنے مرشد شاہ عبد الغنی منگلوریؒ کی تعلیمات پر جس طرح عمل کیا اور ان کا جو خاتمہ بالخیر ہوا اس لحاظ سے سید صاحب کا یہ لکھنا غلط نہ تھا کہ وہ خمخانہ کے بادۂ کیف سے بے خود ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے، مرزا احسان احمد صاحب نے جگر کی سرمستی کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا، پھر بھی انھوں نے اسی زمانہ میں لکھا کہ حضرت جگر ان مخصوص شعراء میں ہیں جن کو قدرت نے صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ محسوسات کی بے رحم حکومت سے آزاد ہو کر صرف عالم روحانی کے اسرار و معارف کی پردہ کشائی کریں (مقدمہ داغ جگر بحوالہ مقالات احسان ص ۳۵۵)

اعظم گڈھ سے جگر کے اس تعلق خاطر کو سامنے رکھ کر شاہ صاحبؒ نے شعلۂ طور پر تبصرہ لکھا، ان کے استاذ محترم حضرت سید صاحبؒ اور ان کے دیرینہ ملنے والے جناب مرزا احسان احمد جگر کے جس طرح معترف تھے ان سب کا احساس ان کو تھا، پھر ان کا قلم ادبی تحریروں کے لیے بہت موزوں ہو چکا تھا، اس لیے جب جگر کے کلام پر تبصرہ کرنے لگے تو ان کے ادبی ذوق نے ادبی انداز کی تحریر لکھنے میں بڑی مدد کی، جس کا ایک نمونہ یہ ہے:

> "گو ان کا (یعنی جگر کا) گلستان شاعری آغاز ہی سے اپنے پر بہار مستقبل کا پتہ دیتا تھا، تاہم آج سے دس برس پہلے اور اب کے کلام میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے، پہلے ایک کلی تھی، اب گل خنداں ہے، پہلے ایک جوئے مستانہ خرام تھا، اب پرشور طوفان ہے، پہلے بے خودی میں احساس بھی شامل تھا، اب ہمہ تن بے خودی اور بے خبری ہے، غرض یہ شراب پرانی ہو کر خالص جوہر بن گئی ہے جس کا ایک ایک قطرہ دوسرے لذت آشناؤں کو بھی سرشار بنا دیتا ہے۔"

ایسے ہی ادبی رنگ میں پورا تبصرہ لکھا ہے، اس میں جگر کی شاعری کو پرکھنے کے لیے فن شاعری کے

اصول بھی مرتب کرتے جاتے ہیں جن کو یہاں پر درج کرنا اس لیے مناسب ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ ان کی نظر و فکر میں اچھی شاعری کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔

ان کے نزدیک شعر کی تاثیر کے لیے سب سے مقدم شرط الفاظ کا مناسب انتخاب اور ان کا صحیح استعمال ہے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ سامعہ کا سب سے پہلا اثر الفاظ کی شیرینی اور اس کے ترنم کا پڑتا ہے، معنی پر بعد میں نظر جاتی ہے، معنوی حیثیت سے شعر کا مفہوم کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، لیکن اگر الفاظ شیریں اور ترکیب مترنم نہیں تو شعر بالکل پست ہو جائے گا اور سننے والے پر اس کا کوئی خاص اثر نہ پڑے گا، اس کے برعکس سادہ سے سادہ تخیل کو الفاظ کی سحرکاری کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔

وہ اپنے ذوق سلیم کے مطابق نظم کی ایک ممتاز خوبی یہ قرار دیتے ہیں کہ خیالات کی نزاکتوں اور ادا کی دقتوں کے باوجود سلاست و روانی میں کوئی فرق نہ آنے پائے، اور کسی جگہ زبان کو ٹھوکر نہ لگے، وہ نظم کی سلاست و روانی کا انتہائی کمال یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو نثر کرنے کے بعد بھی اس کی ترکیب میں فرق نہ آئے، یعنی اگر اسے نثر بنا دیا جائے تو کسی لفظ اور کسی جملہ کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی ضرورت نہ پیش آئے۔

اپنے دور کے بعض لوگوں کے مذاق سخن کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ انقلاب زمانہ کے باوجود یہ ابھی تک خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی اور اسلوب بیان کی ندرت کے مقابلہ میں زبان کی چاشنی ڈھونڈتے ہیں، اور جو شعر اس ٹکسال کا ڈھلا نہیں ہوتا وہ خواہ کتنا ہی بلند اور پاکیزہ کیوں نہ ہو، کھوٹا شمار کیا جاتا ہے، اس پر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں شبہہ نہیں کہ ہر کلام کی خوبی کے لیے خواہ وہ نظم ہو یا نثر، زبان کی صحت اور سلاست نہایت ضروری شرط ہے، لیکن زبان کی صحت اور سلاست الگ شے ہے، اور لطف زبان اور شے ہے، لطف زبان سے مراد وہ مخصوص اور ٹکسالی محاورے ہیں جو اردو کے مرکزوں کی جگہوں میں بولے جاتے ہیں، مگر میرے نزدیک زبان کی خوبی کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ اس میں کوئی صرفی اور نحوی خامی نہ ہو، محاورے کے خلاف نہ ہو، انداز بیان میں فصاحت اور دلکشی ہو، اگر کلام

اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے تو پھر اس کی خوبی کے لیے اور کسی عنصر کی ضرورت نہیں۔

ان کی یہ رائے بھی ہے کہ اردو شعر کا لطف فارسی کے شیریں الفاظ اور دلنشین ترکیبوں سے دوبالا ہو جاتا ہے، اور یہ وہ مرصع کاری ہے جس سے زیور شاعری جگمگا اٹھتا ہے، فارسی کے شیریں الفاظ اور دلنشین ترکیبیں سلیقہ سے کھپائی جائیں تو اردو نثر و نظم کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہیں، اس سلسلہ میں ذرا تیز لہجہ میں کہتے ہیں کہ زبان کی سادگی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں میں کوئی تضاد نہیں ہے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے، تضاد تو ان بد مذاقوں نے پیدا کر دیا ہے جنھیں اردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے کھپانے کا سلیقہ نہیں ہے، اور وہ فارسی کے ہر قسم کے الفاظ خواہ وہ اردو کے آہنگ سے جوڑ کھاتے ہوں یا نہ کھاتے ہوں، عبارت میں ٹھونس دیتے ہیں۔

شاعری کا دل آویز موضوع حسن و عشق ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حسن و عشق کی بنیاد تمام تر دل پر ہے، خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا مجازی، عشق کی آگ اسی چقماق سے پیدا ہوتی ہے، دونوں میں فرق اسی قدر ہے کہ عشق حقیقی میں دل کی کیفیتیں زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہو جاتی ہیں اور ہوا و ہوس کے تمام خس و خاشاک جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں، لیکن دل کا تعلق بہر حال قائم رہتا ہے۔

وہ سوز و گداز کو تغزل کی روح سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اسی سے تغزل کے جسم میں جان پڑتی ہے، گداز عشق سے خالی تغزل ایک شراب بے کیف ہے، اس لیے کہ تغزل نام ہے حسن و عشق کی واردات کی مصوری کا، اور سوز و گداز ہی عشق میں جلا دیتا ہے، اور اسی برق خرمن سوز سے نخل شاعری ہرا ہوتا ہے۔

وہ رنگینی خیال اور رنگینی ادا کو بھی شاعری کا نہایت ضروری عنصر بلکہ رخسارہ شاعری کا گلگونہ تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک شاعری میں روح کی بیداری اور دل کی تڑپ کے ساتھ لبوں کا تبسم

اور چہرہ کی شگفتگی کا سامان بھی ضروری ہے، ورنہ بقول ان کے شاعری محض محفل وجد کے لیے رہ جائیگی، مگر اسی کے ساتھ وہ اس میں اعتدال اور سلامت مذاق قائم رکھنے پر بھی زور دیتے ہیں۔

رندوں اور واعظوں میں پرانی نوک جھونک چلی آتی ہے، شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ جب تک ان دونوں کا وجود دنیا میں باقی رہے گا دونوں کی چشمک چلی جائے گی، اس لیے کہ اس کے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی چھوٹے گی اور نہ حضرت واعظ اپنے مذہبی فریضہ سے چوکیں گے۔

شاعری کے متعلق شاہ صاحبؒ کے یہ خیالات اس کے صحیفہ میں درج کرنے کے قابل ہیں، اس میں دبستان شبلیؒ کی بھی نمایندگی ہے، ممکن ہے کہ بعض ناقدوں کا خیال ہو کہ ان میں کوئی نئی اور اچھوتی بات نہیں کہی گئی، لیکن جس خوبصورت انداز میں پورے وثوق کے ساتھ یہ باتیں کہی گئی ہیں ان سے شاہ صاحبؒ کے ذوق سلیم کا اندازہ ہونے کے علاوہ تازگی اور نیاپن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

ان ہی تمام اصولوں کو اساس بنا کر شاہ صاحبؒ نے جگر کی شاعری پر ایک جامع تبصرہ میں جگر کی شاعری کی ظاہری اور معنوی دونوں خوبیاں دکھائی ہیں، شاہ صاحبؒ نے شاعری میں الفاظ کے مناسب انتخاب، ان کے صحیح استعمال، ان کی شیرینی اور ترنم، ان کی سحر کاری اور ان کی سلاست و روانی پر زور دیا ہے، پھر اسی کو سامنے رکھ کر جگر کی شاعری کا مطالعہ کرکے اپنی اس رائے کا اظہار بڑی بلند آہنگی سے کیا ہے کہ جگر اپنے شیریں اور سادہ الفاظ اور سہل و آسان ترکیبوں سے باغ کی بہار، جوئبار کی مستانہ خرامی، نسیم سحر کی اٹھکھیلیاں اور تبسم موج کی بھی مصوری کرتے ہیں، اور ان ہی سے بادل کی گرج، طوفان کے شور اور آندھی کے زور کے ہولناک مناظر بھی دکھاتے ہیں، ان کو الفاظ کے مناسب انتخاب اور ان کی نشست کا خاص سلیقہ ہے، وہ اگرچہ الفاظ نہایت سادہ استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کی شیرینی اور ترکیب کی خوبی شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔

شاہ صاحبؒ کو جگر کی چھوٹی بحر کی غزلیں زیادہ پسند تھیں، ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ سلاست بیان

کے نہایت اعلیٰ نمونے ہیں، ایسی غزلیں شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے اترتی چلی جاتی ہیں، ان کے یہاں زبان کی چاشنی ڈھونڈنے والوں کے لیے بھی پورا سامان موجود ہے۔

ان کے کلام کی فارسی ترکیبوں سے متعلق شاہ صاحبؒ کی رائے ہے کہ انھوں نے حتی الامکان فارسی ترکیبوں سے احتراز کیا ہے، لیکن ان کا کلام اس کی لطیف آمیزش سے خالی بھی نہیں ہے، جن موقعوں پر انھوں نے فارسی سے کام لیا ہے، اپنی خوش مذاقی سے عجب خوش منظر گنگا جمنی پیدا کر دی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ جگر کی شاعری کی معنوی خوبیاں دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے یہاں خیالات کی وحدت کے ساتھ انداز بیان کا تنوع اور طریق ادا کی نیرنگی ہے، حافظ شیرازی کی طرح ان کے خیالات محدود اور بندھے ہوئے ہیں، لیکن انھیں وہ مختلف پیرایوں میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ بیان کی نیرنگی سے ایک عالم نظر آتا ہے، ساز ایک ہی ہے لیکن اس کا ہر نغمہ اپنے تاثر اور ترنم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف سنائی دیتا ہے، اسی کے ساتھ ان کے یہاں جذبات کی لطافت اور خیالات کی فلک پیما بلندی ہے، غزل کے مضامین محدود ہوتے ہیں، اس میں مشکل سے کوئی اچھوتا مضمون نکل سکتا ہے، لیکن جگر پامال زمین میں بھی نئے نئے گل بوٹے کھلاتے ہیں اور پرانے پھولوں کو اس طرح سجاتے ہیں کہ ہر گلدستہ اپنے رنگ و بو کے اعتبار سے نیا نظر آتا ہے، اور پھر ان تمام چیزوں کو ایسی بے خودی کے عالم میں کہتے ہیں کہ خود اس میں گم ہو جاتے نظر آتے ہیں اور سننے والوں کو بھی مست و بے خود بنا دیتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے جگر کے مادی اور روحانی خیالات کا علٰحدہ علٰحدہ تجزیہ بھی کیا ہے، کہتے ہیں کہ وہ جب تک انسانی پیکر میں عالم آب و گل کی باتیں کرتے ہیں تو کسی نہ کسی حد تک عام شعراء کا ساتھ دیتے ہیں، لیکن جہاں سے روحانی سرحد شروع ہوتی ہے، وہاں سے وہ عالم ناسوت چھوڑ کر عالم لاہوت میں پرواز کر جاتے ہیں، اور روح القدس سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے جگر کی شاعری میں ان کے حسن و عشق کے تخیل کا بھی تجزیہ گہرائی کے ساتھ کیا ہے،

لکھتے ہیں کہ جگر کا عشق بلند اور پاکیزہ ہے، ان کا مطلوب عالم مادی سے ماورا اور مجسم لطافت ہے، ان کے یہاں دل کا مادی واسطہ بھی درمیان میں باقی نہیں رہتا جس میں وہ اپنی ہستی کا پردہ بھی گوارا نہیں کرتے، ان کے ہجر و وصل کی صورت عالم مادی کے وصل و ہجر سے بالکل مختلف ہے، وہ وصال دوست کو عشق کا نقص سمجھتے ہیں، وہ نگاہ کے تحیر اور رگ جاں کے تواجد سے مشاہدۂ جمال کی محرومی کے قائل ہیں، گو تحیر کو عین آرزو قرار دیتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ مشاہدۂ جمال میں دیکھنے والا سراپا نظر بن کر جلووں میں گم ہو جائے، راہ حقیقت کی آخری منزل اس راہ میں گم ہو جانا ہی ہے، پھر اس کو حال و قال اور مقام و قیام کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس میں حسن حقیقت تو مستور رہتا ہے لیکن عشق حقیقی کی تسلی جاری رہتی ہے جس کے بعد بے خودی آگے بڑھ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ جاتی ہے، جہاں جبین و آستانہ میں امتیاز باقی نہیں رہتا، اور عالم وارفتگی میں طالب و مطلوب کی زبان بن جاتا ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جگر نے اپنے ان خیالات کی بلندی کا اظہار مجاز کے پردے میں قصداً کیا ہے، اور وہ اس حجاب کو اٹھانا نہیں چاہتے، کیونکہ یہ حسن حقیقت کے احترام کے منافی ہے، اور پھر شاہ صاحب نے جگر کے شعر ہی سے یہ بھی دکھایا ہے کہ عالم مادی میں نظارہ مشاہدۂ جمال کا وسیلہ ہے لیکن جمال حقیقت کے مشاہدہ کے لیے یہی وسیلۂ حجاب بن جاتا ہے، پھر جگر ہی کے شعر سے یہ بھی ثابت کیا ہے، کہ پردۂ مجاز کے بغیر مجرد جمال حقیقت کا مشاہدہ ان مادی آنکھوں سے ناممکن ہے، اس لیے حسن حقیقت ہمیشہ پردۂ مجاز میں نظر آتا ہے، مگر اس تشابہ کی بنا پر سالک کو ہر ہر قدم پر دھوکا ہوتا ہے اور وہ مجاز کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے، دل کی آنکھ یا چشم بصیرت تو انوار جمال کے گنجینہ کو سمیٹ لیتی ہے، لیکن مادی آنکھوں کی مدد نظر اس کے احاطہ سے قاصر رہتی ہے، اس لیے طالب دیدار کا طالب ہو جاتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ حسن حقیقت کے قید تعین میں آنے کے بعد نظر تعینات و تشخصات میں الجھ کر رہ جاتی ہے، اس لیے طالب اس پردۂ تعین کو ہٹانا چاہتا ہے، لیکن پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ حسن حقیقت جیسی شے

تعینات و تشخصات کی قید میں آ ہی نہیں سکتی کہ سمندر کوزہ میں نہیں سما سکتا۔ اس لیے وہ تعینات کی قید کو عین اوہام کا فریب سمجھنے لگتا ہے، پھر اس کے تصور میں یہ بات آتی ہے کہ وحدت فی الکثرت اور کثرت فی الوحدت یا وحدت الوجود یعنی تمام کائنات عالم ایک ہی اصل کی فرع اور ایک ہی آفتاب کا پرتو اور ایک ہی تصویر کا مرقع ہے،

شاہ صاحب نے اپنی دیدہ وری اور نکتہ آفرینی سے جگر کی بظاہر غنائیہ اور غزلیہ شاعری میں کیسا فلسفیانہ اور صوفیانہ رنگ پیدا کر دیا ہے، شاہ صاحب کو جگر کی شاعری میں یہ رنگ پیدا کرنے میں ان کو اپنی خاندانی روایات سے بھی مدد ملی ہے، صابریہ چشتیہ کی تعلیمات کا غلغلہ ان کے گھر کے علاوہ ردولی کی خانقاہ کی مجلسوں اور وہاں کے عرس کے موقع پر سماع کی محفلوں میں بلند ہوتا رہا۔

شاہ صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ جگر کے اس مخصوص رنگ کے علاوہ ان کا ایک عام رنگ بھی ہے، یعنی جب وہ پامال شاہراہ پر چلتے ہیں تو اس میں بھی اپنا راستہ الگ نکالتے ہیں، مثلاً محبوب کا عتاب عاشق کے لیے ایک جانگسل مصیبت ہے، لیکن جگر کی نگاہ دل اس میں بھی کرم کا سامان تلاش کر لیتی ہے جگر کا حرمان نصیب دل سکون سے ہمیشہ محروم رہتا ہے، اس لیے کہ سکون ہونے میں بھی اضطراب دل بن جاتا ہے جو اضطراب کا اصل سبب ہے، گویا اضطراب ہی شکل بدلتا رہتا ہے، اسی طرح جگر اپنی عالی ظرفی میں ستم یار کی شکایت سے زبان آلودہ نہیں کرتے بلکہ ستم خاص کی تمنا کرتے ہیں، وہ تو زبان پر مطلوب کا ذکر بھی لانا احترام حسن کے منافی سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب نے جگر کے اشعار میں گداز عشق کی اچھوتی شکلوں کی بھی تلاش کی ہے، کہتے ہیں جگر نے ایک درد آشنا دل پایا ہے، کبھی کبھی اس کے ٹوٹے ہوئے دل سے بھی آہ سوزاں نکل جاتی ہے، مگر وہ عاشقی کو مصیبت نہیں سمجھتے بلکہ ان کا درد پسند دل اس سے لذت یاب ہوتا اور کمال لذت کے لیے سراپا درد بن جاتا ہے، عام شعراء کے خلاف ان کے یہاں غم ہجر جانگسل ہونے کے بجائے جاں نواز ہے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جگر نے یہ سب کچھ رنگینی کی لطیف آمیزش سے کیا ہے، ان کے یہاں جوانی، نگاہ مست، نگاہ گستاخ، نگاہ کی مے باری وغیرہ کی بڑی رنگین مرقع آرائی ہے، ان کی بعض غزلیں تو پوری کی پوری خیالات اور بیان کی رنگینی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

جگر کے یہاں خمریات بھی بہت ہیں، اس کے متعلق شاہ صاحب کی رائے ہے کہ ان کے خمخانہ میں ہر رنگ و بو، ہر مزہ اور ہر درجہ کی شراب ہے اور اس کے اثرات بھی مختلف ہیں، کسی میں سرخوشی کی حد تک نشہ، کسی میں مستی اور کسی میں بدمستی تک، لیکن اس عالم مستی میں جگر کے حواس قائم رہتے ہیں، وہ ان مہذب رندوں میں ہیں جو واعظوں پر نہایت لطیف اور ظریفانہ پھبتیاں کستے ہیں لیکن تہذیب کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے۔

شاہ صاحب جگر کو اخلاق کا علمبردار یا پیامبر نہیں سمجھتے اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی شاعری میں اخلاق کا عنصر تو ہے لیکن بہت کم ہے۔

شعلۂ طور میں جگر کا کچھ فارسی کلام بھی ہے، لیکن شاہ صاحب اس پر صرف اتنا تبصرہ کرتے ہیں کہ انھوں نے حافظ شیرازی کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کا میدان نہیں۔

شاہ صاحبؒ نے یہ مضمون تقریباً پچاس برس پہلے لکھا تھا، اس میں جگر کی شاعری کا جس طرح تجزیہ کیا گیا ہے وہ ان کی شاعری پر لکھنے والوں کے لیے آج بھی مشعل ہدایت ہے، ان کی شاعری کا کون سا پہلو ایسا ہے جس پر اس میں بحث نہیں کی گئی ہے، علامہ شبلیؒ نے موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کی پانچوں جلدوں میں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ اگر وہ کسی شاعر کے محاسن کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے ثبوت میں بکثرت اشعار پیش کرتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشعار کا مطالعہ پوری دیدہ وری سے کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہے، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم نے اپنی مشہور کتاب شعر الہند میں بھی یہی انداز اختیار کیا ہے، حضرت سید صاحبؒ بھی جب شعر و ادب پر کچھ لکھتے تو یہی رنگ اپناتے، شاہ صاحبؒ نے اپنے اس مضمون میں

جگر کی گوناگوں خوبیاں دکھانے میں ان کے اشعار بکثرت نقل کیے ہیں، یہ انداز ان نقادوں کے لیے مشکل اور صبر آزما معلوم ہوگا جو ایک دعویٰ تو کر بیٹھتے ہیں لیکن اس کے ثبوت میں اشعار نقل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، اس میں ان کی سہل انگاری کو بھی بڑا دخل ہے، دبستان شبلی میں ایسی سہل انگاری پسند نہیں کی جاتی، پھر مضمون وہی اچھا سمجھا جاتا ہے جو خود بولے کہ یہ سلیقے، محنت اور ریاضت سے لکھا گیا ہے، شاہ صاحبؒ کا یہ مضمون بھی سب کچھ بولتا ہے، اس کو پڑھ کر ناظرین کو اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ کو اگر ادبی تحریر لکھنے میں پوری قدرت حاصل ہوگئی تھی تو اس کو قلمبند کرتے وقت وہ نہ صرف فن شاعری کے رموز سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ حسن و عشق، حال و قال، مشاہدۂ جمال، راہِ سلوک کے احوال، وحدت فی الکثرت اور کثرت فی الوحدت وغیرہ کے اسرار کے بھی واقف کار تھے پھر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ قرآن مجید اور حدیث جیسے موضوعات پر لکھنے والے عموماً شعر و ادب پر اچھی تحریریں نہیں لکھ پاتے، مگر یہ دبستان شبلیؒ اور حضرت سید صاحبؒ کی تربیت کا فیض تھا کہ شاہ صاحبؒ قرآن اور حدیث پر جس جوش و خروش سے مضامین لکھتے، اس سے زیادہ زور اور طاقت سے شعر و ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنی تحریر کی خوش سلیقگی کا اظہار کرتے۔ (باقی)

حیات سلیمان

یہ سید صاحب علیہ الرحمہ کی محض سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ سید صاحبؒ کے پورے دور کی تمام ملی و قومی، سیاسی و علمی اور ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثر حجاز وغیرہ کی پوری "تاریخ" ہے، اس میں دار المصنفین کی سال بہ سال ترقی کی روداد، ترک قیام دار المصنفین سفر بھوپال، پھر قیام پاکستان، اور انھوں نے پاکستان میں جو علمی و ملی خدمات انجام دیں، ان کی بھی تفصیل آگئی ہے۔ از مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ۔ قیمت ۳۲، روپے

سیرتِ نبویؐ کے قدیم و اولین مآخذ

اور

ان کا تنقیدی جائزہ[۱]

از

ڈاکٹر تقی الدین ندوی مستشار علمی دائرۃ القضاء الشرعی، استاذ حدیث عین یونیورسٹی۔ ابوظبی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر عہد میں سیرت نبویؐ کے ساتھ جس غایت درجہ کا اہتمام و اعتناء کیا گیا ہے، علوم انسانی کی تاریخ میں اس کی نظیر مفقود ہے، "بلاشبہہ مسلمانوں کے اس فخر و امتیاز کا تا قیامت کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبرؐ کے سوانح اور وقائع کا ایک ایک حرف اس استقصاء، صحت اور استناد کے ساتھ محفوظ رکھا کہ دنیا میں کسی شخص کے حالات و واقعات آج تک اس احتیاط و جامعیت کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے"۔ دوسرے مذاہب کے داعیوں اور رسولوں کے سوانح اور کارناموں کی تصویر ہمیں تاریخ میں بہت ناتمام ملتی ہے، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس وسعت و تفصیل کے ساتھ قلمبند کی گئی ہے کہ آپؐ کے اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت، اکل و شرب، نشست و برخاست، اور سونے جاگنے کی ایک ایک ادا محفوظ ہو گئی ہے، اور اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

---

[۱] یہ مقالہ دوحہ (قطر) کی تیسری عالمی سیرت کانفرنس منعقدہ ۲۳ تا ۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

دیگر مذاہب کے اصول و تعلیمات وقتی تھے ابدی نہ تھے، اور یہی ہمہ گیری وابدیت اسلام اور داعیِ اسلام کا خصوصی طغرائے امتیاز ہے، پیشِ نظر مقالہ میں راقم سطور نے مذکورۂ بالا حقیقت کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے سیرت نبویؐ کے قدیم اور اولین ماخذوں کا ایک جامع جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس موضوع پر آئندہ تفصیلی مطالعہ یا تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے دلیلِ راہ ثابت ہو سکے۔

سیرت نبویؐ کا سب سے اہم اور مستند ترین ماخذ قرآن پاک ہے، اس کے مطالعہ سے کہیں تو اجمالاً اور کہیں تفصیلی طور پر سیرت نبویؐ کے بکثرت گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ بعثت نبویؐ سے قبل اور بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن مراحل وکیفیات سے دوچار ہوئے، مثلاً آپؐ کی یتیمی، غارِ حرا میں عزلت نشینی، نزولِ وحی، اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اس راہ میں صعوبات ومصائب کا تحمل، ہجرت اور غزوات وغیرہ سب کی تفصیل قرآن میں محفوظ ملتی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کے پایۂ صحت واعتبار میں کسی طرح کا شک کفر ہے۔

قرآن کے بعد سیرت نبویؐ کا دوسرا اہم ترین ماخذ حدیث کا قیمتی ذخیرہ ہے، اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شب وروز کی زندگی، اخلاق وعادات اور رجحانات ومیلانات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر رواۃ حدیث نے حجۃ الوداع کے تاریخی سفر اور عہد آفریں واقعہ کے ہر ہر جزئیہ کو نہایت صحت وگیرائی کے ساتھ بیان کیا ہے، خواہ تاریخی حیثیت سے اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہ ہو، چنانچہ بکثرت علماء نے صرف ذخیرۂ حدیث کی بنیاد پر سیرت نبویؐ پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں، دنیا میں کسی بھی داعیِ مذہب کے اقوال وافعال کی حفاظت کے ساتھ اس کے متبعین نے وہ اعتنا نہیں کیا ہے جو صحابۂ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین اور محدثین نے احادیث نبویؐ کے ساتھ کیا ہے، یہاں تک کہ احادیث کی تحقیق کی غرض سے ہزاروں، لاکھوں راویوں کے نام وحالات قلمبند کیے گئے اور اس طرح اسماء الرجال کا ایک عظیم فن وجود میں آ گیا، کتب حدیث میں باعتبار صحت صحاح ستہ اور ان میں بھی

بخاری ومسلم کو فوقیت حاصل ہے، اس کے بعد کتبِ مسانید کا درجہ ہے، جن میں امام احمد بن حنبلؒ (المتوفی ۲۴۱ھ) کی شہرۂ آفاق مسند مختلف حیثیتوں سے سب سے ممتاز وفائق ہے۔

<u>تیسرا ماخذ: کتبِ دلائل نبوت</u> علماء ومحدثین نے دلائل نبوت پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے، چنانچہ کتب صحاح میں ایسے مستقل ابواب ملتے ہیں جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور ان کے دلائل نبوت کو جمع کر دیا گیا ہے، مثلاً امام بخاریؒ ومسلمؒ نے صحیحین میں اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں علامات نبوت اور معجزات رسولؐ کے علٰحدہ ابواب قائم کیے ہیں، علاوہ ازیں متعدد علماء نے دلائلِ نبوت کے موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں، جن میں سے حسب ذیل لائق ذکر ہیں:

(۱) دلائل النبوۃ، مولفہ ابو نعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی (المتوفی ۴۳۰ھ) اس میں حافظ ابو نعیم نے حیات نبویؐ پر روشنی ڈالنے کے بعد معجزات رسولؐ اور ان کی حقانیت کو ثابت کیا ہے، جامعینِ حدیث کے عام طریقۂ کار کے مطابق اس کتاب میں بھی صحیح وضعیف روایات باہم خلط ملط ہو گئی ہیں، اس کا خلاصہ حیدرآباد سے ۱۹۵۰ء میں طبع ہو چکا ہے، امام ابو نعیم ایک بلند پایہ مورخ اور ثقہ حافظ حدیث تھے، انھوں نے دلائل نبوت کے علاوہ دس ضخیم جلدوں میں حلیۃ الاولیاء، اور معرفۃ الصحابہ وغیرہ کتابیں تالیف کی ہیں[1]۔

(۲) دلائل النبوۃ، مولفہ حافظ ابو العباس جعفر بن محمد المعتز المستغفری (المتوفی ۴۳۲ھ) امام مستغفری اپنے عہد کے ممتاز حفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں، ابن ناصر الدین کا قول ہے کہ وہ ثقہ حافظ حدیث تھے، مگر کبھی وہ بغیر وضاحت وتحقیق کے موضوعات بھی روایت کرتے تھے[2]، ابن مندہ کا بیان ہے کہ:

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: وفیات الاعیان ج ۱، ص ۲۶۔ میزان الاعتدال ج ۱، ص ۵۲۔ لسان المیزان ج ۱، ص ۲۰۱، طبقات الشافعیہ ج ۳، ص ۷۔ الاعلام زرکلی ج ۱، ص ۵۵ [2] شذرات الذہب ج ۳، ص ۲۴۹۔

اذا وجدت فی اسنادہ زاھدًا — جب تم ان کی سند میں کسی زاہد کو پاؤ تو

فاغسل یدلک من ظاھر الحدیث[1] — اس کو چھوڑ دو۔

(۳) دلائل النبوۃ، مولفہ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن واقد الفریابی (المتوفی سنہ ۲۱۲ھ) امام فریابیؒ نے مشہور تبع تابعین امام اوزاعی و سفیان ثوریؒ سے خصوصی استفادہ کیا تھا، اور امام بخاری ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمدؒ بھی ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے، مگر راستہ ہی میں ان کی وفات کی خبر مل گئی، حافظ ذہبی نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔[2]

(۴) دلائل النبوۃ، مولفہ امام ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی (المتوفی سنہ ۴۵۸ھ) اس کے آغاز میں امام بیہقیؒ نے سیرت نبویؐ قلمبند کرنے کے بعد معجزات حسیہ پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے مگر اس میں بہت سی ضعیف روایات راہ پاگئی ہیں، یہ کتاب متعدد بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے، آخری بار استاذ سید صقر کی تحقیق کے ساتھ قاہرہ سے شایع ہوئی، حافظ بیہقی حفظ و اتقان اور ثقاہت و عدالت میں بقول ابن ناصر الدین یکتائے عہد شمار ہوتے تھے، کثرت تصانیف میں ان کی نظیر خال خال ہی ملتی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مختلف علوم و فنون میں ایک ہزار کتابیں تالیف کی ہیں، نیشاپور اور خراسان میں مذہب شافعیت کے فروغ و شیوع میں ان کی تصانیف کا بڑا حصہ ہے، ابن خلکان رقمطراز ہیں:

هو اول من جمع نصوص الشافعی — انھوں نے سب سے پہلے امام شافعیؒ کے

فی عشر مجلدات وکان اکثر — نصوص کو دس جلدوں میں جمع کیا، اور

الناس لنصر المذھب الشافعی[3] — مذہب شافعیت کو سب سے زیادہ ان ہی سے

مدد پہونچی۔

---

[1] طبقات السیوطی ص ۲۵۴۔ کشف الظنون ج ۳، ص ۲۳۸۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۳۷۶، شذرات الذہب ج ۳، ص ۱۰۲۔ الاعلام ج ۷، ص ۹۸۔ [3] وفیات الاعیان ج ۱، ص ۲۰۴۔

امام الحرمین کا بیان ہے کہ:

ما من شافعی الا وللشافعی علیه — ہر شافعی المسلک امام شافعیؒ کا منت کش ہے

منة الا البیهقی فان له علی الشافعی — مگر علامہ بیہقی کا خود امام شافعیؒ پر یہ احسان ہے

منة لتصانیفه فی نصرة مذھبه[1] — کہ ان کی تصانیف کے ذریعہ مذہب شافعیت کے فروغ میں بہت مدد ملی۔

دلائل النبوۃ کے علاوہ امام بیہقی کی چند لائق ذکر تالیفات یہ ہیں: السنن الکبریٰ، کتاب الزھد، کتاب الاسماء والصفات، کتاب الخلاف، مناقب الامام الشافعی۔[2]

(۵) دلائل النبوۃ، مولفہ ابو القاسم اسماعیل بن محمد الاصفہانی (المتوفی سنہ ۵۳۵ھ) اس کتاب کے مؤلف تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب میں منتخب عصر شمار ہوتے تھے، ابن مندہ کا قول ہے کہ لیس فی وقتنا مثله، یعنی ہمارے عہد میں وہ عدیم النظیر ہیں، حافظ ابن عمادؒ حنبلی نے ان کے بارے میں ائمہ بغداد کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

ما دخل الی بغداد بعد احمد بن حنبل — امام احمدؒ بن حنبل کے بعد سرزمین بغداد پر

افضل ولا احفظ منه[3] — ان سے بڑا اہل علم اور حافظ حدیث نہیں آیا۔

(۶) الخصائص الکبریٰ، مولفہ امام جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر السیوطی (المتوفی سنہ ۹۱۱ھ) یہ کتاب سیرت و شمائل نبویؐ اور دلائل نبوت پر مشتمل ہے، حافظ سیوطی کی جلیل القدر شخصیت بہت معروف ہے، انھوں نے مختلف علوم و فنون میں چھ سو کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں اس کتاب کے علاوہ الاتقان فی علوم القرآن، الاشباہ والنظائر، بغیۃ الوعاۃ، حسن المحاضرۃ، الدر المنثور فی التفسیر الماثور، تاریخ الخلفاء اور الالفیۃ فی مصطلح الحدیث کے نام خصوصیت سے

---

[1] شذرات الذہب ج ۳، ص ۳۰۵۔ [2] الاعلام زرکلی ج ۱، ص ۳۰۲ [3] شذرات الذہب ج ۴، ص ۱۰۶۔

لائقِ ذکر ہیں[1]:

چوتھا ماخذ: کتب شمائل | اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات، فضائل وشیم اور شب وروز کے معمولات کی تفصیلات پر مشتمل ہیں، علماء ومصنفین نے ابتدائی زمانہ ہی سے اس موضوع کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اور اس میں بکثرت کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں سے کچھ لائق ذکر حسب ذیل ہیں:

(۱) الشمائل النبویۃ والخصائص المصطفویۃ، مولفہ ابو عیسیٰ محمد بن سورۃ الترمذی (المتوفی ۲۷۹ھ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وعادات اور اخلاق وشمائل پر اب تک جتنی کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں اُن میں یہ کتاب اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں تمام روایتوں کے معتبر اور صحیح ہونے کا خصوصی التزام کیا گیا ہے، اس کی افادیت کے باعث متعدد علماء نے اس کے شروح وحواشی لکھے ہیں، یہ کتاب دار الطباعۃ العامرۃ دمشق سے ایک جلد میں شائع ہو چکی ہے، استاذ محمود سامی نے المختصر فی الشمائل النبویۃ وشرحہا" کے نام سے اس کی تلخیص وشرح لکھی ہے، جو ۱۹۵۰ء میں قاہرہ سے طبع ہوئی۔

(۲) اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم وآدابہ: مولفہ حافظ عبد اللہ بن محمد بن جعفر بن حبان الاصفہانی (المتوفی ۳۶۹ھ) اس میں مؤلف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات واخلاق اور عادات واطوار کو جمع کر دیا ہے، یہ کتاب عبد اللہ محمد الصدیق الغماری کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۵۹ء میں قاہرہ سے طبع ہو چکی ہے۔

(۳) کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفٰے مولفہ قاضی ابو الفضل بن موسیٰ اندلسی (المتوفی ۵۴۴ھ)

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الکواکب السائرۃ ج ص ۲۲۶، شذرات الذہب ج ۸، ص ۵۱۔ آداب اللغۃ ج ۳، ص ۲۲۸، الضوء اللامع ج ۴ ص ۶۵۔ حسن المحاضرۃ ج ۱، ص ۱۸۸۔

دو[2] جلدوں پر مشتمل یہ اپنے موضوع پر ایک عدیم النظیر کتاب ہے، اور افادیت کے پیش نظر متعدد بار طبع ہو چکی ہے، آخری بار ۱۳۹۱ھ میں دمشق سے شیخ ابو الفتاح ابو غدہ کی تعلیق کے ساتھ نہایت دیدہ زیب طباعت میں منظر عام پر آئی، قاضی عیاض چھٹی صدی ہجری میں اندلس کے ایک نامور عالم اور امام حدیث کی حیثیت سے شہرۂ آفاق ہوئے، حدیث کے علاوہ لغت، ادب، نحو، تاریخ اور انساب میں یکتائے عہد شمار ہوتے ہیں، ملا علی قاری اپنی شرح شفا کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

کان وحید زمانہ وفرید اوانہ	وہ وحید زمانہ اور یکتائے عصر تھے،
متقنا لعلوم الحدیث واللغۃ	علم حدیث، لغت، نحو، ادب، تاریخ عرب
والنحو والآداب عالما بایام العرب	انساب کے متبحر عالم تھے۔
والانساب[1]۔	

کتاب الشفاء کے علاوہ مختلف علوم میں ان کی تیس[30] مولفات یادگار ہیں، جن میں الاکمال شرح صحیح مسلم، مشارق الانوار، کتاب المدارک وتقریب المسالک اور شرح حدیث ام زرع وغیرہ کے نام لائق ذکر ہیں۔

کتاب الشفاء قاضی عیاض کی مقبولیت اور افادیت کے باعث علمائے متاخرین نے اس کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا، اور اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں، جن میں درج ذیل دو[2] سب سے زیادہ مشہور ہیں:

(۱) نسیم الریاض فی شرح الشفا للقاضی عیاض مولفہ امام احمد بن محمد الخفاجی (المتوفی ۱۰۶۹ھ) یہ مبسوط شرح چار[4] ضخیم جلدوں میں دمشق سے ۱۲۶۷ھ میں شائع ہوئی (۲) شرح الشفا فی شمائل صاحب الاصطفٰے مولفہ ملا علی قاری (المتوفی ۱۰۱۴ھ) یہ بھی چار[4] ضخیم مجلدات میں حسین محمد مخلوف کی تحقیق کے ساتھ ۱۳۹۸ھ میں قاہرہ سے طبع ہوئی۔

---

[1] شرح الشفا فی شمائل صاحب الاصطفٰے ج ۱، ص ۵۔

امام نورالدین علی بن محمد المعروف بہ ملا علی القاری عہد متاخر کے علمائے کبار میں شمار ہوتے ہیں، ان کا معمول تھا کہ ہر سال اپنے قلم سے ایک قرآن پاک لکھتے اور اس کو فروخت کرکے پورے سال کا رزق کفاف فراہم کرتے تھے، وہ شرح شفا کے دیباچہ میں اس کے سبب تالیف کے سلسلہ میں خود رقمطراز ہیں:

لما رأیت کتاب الشفا فی شمائل المصطفٰی اجمع ما صنف فی بابہ مجملاً من الاستیفاء قصدت ان اخدمہ بشرح یشرح بعض ما یتعلق بہ من تحقیق الاعراب و البناء رجاء ان اسلک فی سلک مسالک العلماء یوم الجزاء[۱]

جب میں نے قاضی عیاض کی تصنیف کتاب الشفاء فی شمائل المصطفٰی کو دیکھا تو اسے اس موضوع پر لکھی گئی تمام مختصر کتابوں کی جامع پایا، اس لیے میں نے اس کی شرح لکھنے کا عزم کیا۔ تاکہ آخرت کے روز علماء کے ساتھ محشور ہونا نصیب ہو۔

مذکورۃ الصدر کتب شمائل کے علاوہ اس موضوع پر بعض دوسرے علماء نے بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں: (۱) شمائل النبیؐ مولفہ ابو العباس المستغفری (المتوفی ۴۳۲ھ) (۲) النور الساطع مولفہ ابن المقری (المتوفی ۵۵۲ھ) (۳) سفر السعادۃ مولفہ امام مجد الدین الفیروز آبادی (المتوفی ۸۱۲ھ) (۴) شمائل الرسول مولفہ حافظ ابن کثیر (المتوفی ۷۷۴ھ)

پانچواں ماخذ: کتب مغازی عقلی و قیاسی حیثیت سے فن سیرت میں سب سے پہلے مغازی کی روایتوں کو فروغ حاصل ہونا چاہیے تھا، کیونکہ عرب میں مختلف وجوہ سے جنگوں اور معرکوں کے واقعات محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا، لیکن عہد بنی امیہ کے وسط تک فن مغازی و سیر کے ساتھ کسی اعتنا کا ثبوت نہیں ملتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (المتوفی ۱۲۰ھ)

[۱] شرح الشفاء فی شمائل صاحب الاصطفا ج ۱، ص ۵۔

کو جو فن مغازی میں خاص کمال رکھتے تھے، حکم دیا کہ جامع دمشق میں حلقۂ درس قائم کرکے لوگوں کو مغازی اور مناقب صحابہؓ کا درس دیں[۱]۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہوگیا، اور پہلی صدی ہجری میں متعدد اکابر علماء نے اس فن میں مستقل کتابیں تالیف کیں، جن میں سے اکثر اگرچہ آج ناپید ہیں، مگر متاخرین کی تصنیفات میں ان کا بڑا حصہ شامل ہوگیا ہے، ذیل میں ہم ان اکابرین امت کے نام اور ان کی تصنیفات کی ایک جامع فہرست درج کرتے ہیں جو فن مغازی و سیر کے ارکان و اساطین شمار ہوتے ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ سیرت نبویؐ کے دیگر مستند ماخذوں میں کتب مغازی کا مقام کتنا اہم ہے۔

(۱) عروہ ابن زبیرؓ بن العوام (المتوفی ۹۴ھ) مدینہ کے فقہائے سبعہ میں شمار کیے جاتے ہیں، سیر و مغازی میں ان کی روایتیں بہت کثرت سے ملتی ہیں، ابن سعد نے انھیں ثقہ، کثیر الحدیث، فقیہ اور عدول و ثبت قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ کان عالماً بالسیرۃ[۲]۔ حاجی خلیفہ نے بعض علماء کی یہ رائے نقل کی ہے کہ

ھو اول من صنف بالمغازی[۳]۔

ان ہی نے فن مغازی میں سب سے پہلی کتاب تصنیف کی۔

(۲) وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) جلیل القدر تابعین کرام میں تھے، علمائے جرح و تعدیل ان کی توثیق پر متفق ہیں، سیرت نبویؐ کے بارے میں کتب عہد قدیم کی بشارتوں اور پیش گوئیوں کے علم میں شہرت عام رکھتے ہیں[۴]۔

[۱] تہذیب التہذیب ج ۸، ص ۲۰۴ [۲] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱، ص ۶۲ [۳] کشف الظنون ج ۲، ص ۲۰۷۔ مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۸۰۔ حلیۃ الاولیاء ج ۲، ص ۱۷۶۔ الاعلام زرکلی ج ۵ ص ۱۷۔ [۴] وہب بن منبہ کے حالات و کمالات کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں تہذیب الاسماء واللغات ج ۲، ص ۱۴۹ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۶۶۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵۔ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۸۰، شذرات الذہب ج ۱، ص ۱۵۰۔

(۳) محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (المتوفی ۱۲۳ھ) امام زہری زمرۂ تابعین کے گل سرسبد تھے، فقہ وحدیث کی معرفت و تبحر میں نادرۂ عصر تھے، حدیث و روایت کی تحصیل انھوں نے جس غیر معمولی جانکاہی کے ساتھ کی، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں گھر گھر جاتے اور بوڑھا جوان اا دھیڑ جو بھی ملتا یہاں تک کہ پردہ نشین خواتین سے بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وحالات پوچھتے اور قلمبند کرتے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے عہد میں ان کی ہدایت کے مطابق مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی جسے سہیلی نے روض الانف میں اس فن کی پہلی کتاب قرار دیا ہے، امام زہری کے حلقۂ درس سے جو اصحاب کمال پیدا ہوئے اُن میں موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق فن مغازی میں امتیاز خاص رکھتے ہیں۔

(۴) امام ابو عمرو عامر بن شراحیل الشعبی (المتوفی ۱۰۳ھ) انھیں پانچ سو صحابہ کرامؓ کے دیدار کی سعادت حاصل ہوئی تھی، فقہ وحدیث اور مغازی وسیر میں درجۂ کمال رکھتے تھے، ایک بار وہ اپنے تلامذہ کو مغازی کا درس دے رہے تھے کہ اسی اثنا میں عبداللہ بن عمرؓ کا ادھر سے گذر ہوا تو فرمایا: "میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان غزوات کو جانتے ہیں"[1]۔ خطیب بغدادی نے ان کی تصنیفات میں "کتاب المغازی" کا ذکر کیا ہے[2]۔

(۵) عاصم بن عمر بن قتادۃ الانصاری (المتوفی ۱۲۰ھ) مغازی وسیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے حکم سے جامع دمشق میں بیٹھ کر تشنگان علم کو مغازی اور مناقب صحابہؓ کا درس دیا کرتے تھے، ابن سعد نے انھیں ثقہ اور کثیر الحدیث قرار دیا ہے، اور ابن حبان نے کتاب الثقات میں بصراحت ان کی توثیق کی ہے[3]۔

[1] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۷۸۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۳۰۔ طبقات السیوطی، ص ۳۲۔
[3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۲۲۔

(۶) ابو اسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی (المتوفی ۱۲۷ھ) نہایت جلیل المرتبت تابعی ہیں، انھیں اڑتیس ۳۸ صحابۂ کرام کے دیدار اور سماعِ حدیث کی سعادت نصیب ہوئی تھی، خانوادۂ سبیعی علماء و فضلاء کا مخزن تھا اور اس کا ہر فرد آسمانِ علم وفن کا اختر تاباں تھا، ابو اسحاق سبیعی اس خاندانِ فضل وکمال کے ابو الآباء تھے، وہ فقہ وحدیث اور مغازی میں کامل تبحر کے ساتھ زہد و اتقاء، عبادت و دیانت اور ورع و تقویٰ میں بھی اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ مغازی وسیر کی معرفت میں شہرۂ آفاق تھے[1]۔

(۷) یعقوب بن عتبہ بن المغیرۃ المدنی (المتوفی ۱۲۸ھ) امام زہریؒ کے معاصر اور نہایت ثقہ عالم تھے، اُن کا شمار مدینہ کے چند منتخب فقہاء میں ہوتا ہے، سیرت نبویؐ کے بہت اعلیٰ پایے کے عالم تھے۔

(۸) یزید بن رومان الاسدی (المتوفی ۱۳۰ھ) جلیل المرتبت محدث اور حضرت عروہؓ و امام زہریؒ کے شاگرد تھے، مغازی میں انھوں نے بھی ایک کتاب تالیف کی ہے۔

(۹) ابو المعتمر سلیمان بن طرخان (المتوفی ۱۴۳ھ) حضرت انس بن مالکؓ اور امام حسن بصریؒ کے اجل تلامذہ میں تھے، روایات کی باریک بینی اور دقیقہ رسی میں قابل تحسین قرار دیے جاتے ہیں، ان کے علمی کارناموں میں کتاب المغازی کا سراغ ملتا ہے۔

(۱۰) موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش الاسدی (المتوفی ۱۴۱ھ) یہ آل زبیر کے غلام تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا تھا، ان کے اساتذہ میں امام زہریؒ اور تلامذہ میں امام مالکؒ شہرۂ آفاق ہوئے، انھوں نے فن مغازی میں ایک کتاب تالیف کی تھی جو اپنے موضوع پر اہم ترین مراجع میں شمار ہوتی ہے، امام مالکؒ سے جب کبھی مغازی کے بارے میں سوال کیا جاتا تو فرماتے:

علیکم بمغازی الرجل الصالح — مغازی کا علم حاصل کرنا ہو تو موسیٰ بن عقبہ سے

[1] طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۷۰۔

موسیٰ بن عقبۃ فانہا اصح المغازی[۱] — سیکھو، کیونکہ ان کے مغازی سب سے زیادہ صحیح ہیں۔

امام موسیٰ بن عقبہ کے مغازی کی نمایاں ترین خصوصیت روایات میں احتیاط اور صحت کا غایت درجہ التزام ہے، آج موسیٰ کی اصل کتاب ناپید ہے، لیکن سیرت کی تمام قدیم و جدید کتابوں میں اس کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔

(۱۱) محمد بن اسحاق بن یسار المدنی (المتوفی سنہ ۱۵۰ھ): انھوں نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، یہاں تک کہ زبان خلق نے "امام فن مغازی" کا لقب عطا کیا، ابن شہاب زہریؒ کا قول ہے کہ

من اراد المغازی فعلیہ محمد بن اسحاق[۲] — جو شخص مغازی کی واقفیت حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحاق سے استفادہ کرے۔

امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ

من اراد ان یتبحر فی المغازی فھو عیال علی محمد بن اسحق[۳] — جو فن مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحاق کا محتاج ہے۔

حدیث میں بھی باکمال تھے، مگر ان کی ثقاہت کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل اختلاف رائے رکھتے ہیں، امام مالکؒ کی ان کے بارے میں سخت رائے تھی، مگر پھر اس سے رجوع کر لیا تھا[۴]، تاہم اکثر اکابر محدثین کی رائے ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایات قابل استناد ہیں، امام بخاریؒ نے گو جامع صحیح میں ان کی روایات کی تخریج نہیں کی، مگر جزء القراۃ میں ان سے روایت لی ہے، اور "تاریخ" میں تو بکثرت

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۷۴۔ [۲] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۷۵۔ [۳] وفیات الاعیان ج ۱، ص ۱۰۵۔ [۴] الاعلام زرکلی ج ۵، ص ۱۰۶۔

روایات ان سے لی ہیں۔

محمد بن اسحاق کی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب المغازی" کے منصۂ شہود پر آجانے کے بعد یہ فن اس قدر ترقی یافتہ اور دلچسپ بن گیا کہ اہل علم میں عام طور پر اس کا مذاق پیدا ہونے لگا، ابن عدی نے لکھا ہے کہ فن مغازی میں کوئی تصنیف محمد بن اسحاق کی کتاب کے رتبہ کو نہیں پہنچتی، یہ کتاب کثرت سے پھیلی اور اکابر محدثین نے اس کے نسخے مرتب کیے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیاد البکائی سے سند اجازت حاصل کرنے کے بعد مزید تنقیح و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا جو آج سیرت ابن ہشام کے نام سے معروف ہے۔

(۱۲) معمر بن راشد الازدی (المتوفی سنہ ۱۵۰ھ) یہ امام زہری اور حضرت قتادہؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، علم حدیث کے اساطین میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے جرح و تعدیل ان کی ثقاہت و عدالت پر متفق ہیں، بالخصوص امام زہریؒ سے ان کی مرویات کا پایہ نہایت بلند ہے[۱]، ابن عماد حنبلی رقمطراز ہیں "احد الاعلام الثقات الاماما لحجۃ"[۲]، مغازی میں ان کی ایک تصنیف ہے جس کا نام ابن ندیم نے 'کتاب المغازی' لکھا ہے[۳]۔

(۱۳) محمد بن صالح بن دینار (المتوفی سنہ ۱۶۸ھ) امام زہریؒ کے تلامذہ اور واقدی کے اساتذہ میں بلند مقام رکھتے ہیں، ابن سعد نے لکھا ہے کہ

انہ کان عالماً بالسیرۃ والمغازی[۴] — بلاشبہ وہ سیرت و مغازی کے بڑے عالم تھے

ابوالزنادؒ جیسے اعلیٰ پایہ امام حدیث کا بیان ہے کہ

من اراد ان یتعلم المغازی فعلیہ محمد بن صالح[۵] — جو شخص مغازی کا علم حاصل کرنا چاہے اسے حافظ محمد بن صالح سے استفادہ کرنا چاہیے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۱۷۱، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۸۸۔ [۲] شذرات الذہب ج ۱، ص ۲۳۵۔ [۳] الفہرست لابن ندیم ص ۲۷۷۔ [۴] طبقات ابن سعد ج ۶، ص ۷۸۔ [۵] ایضاً۔

(۱۴) ابو محمد عبد اللہ بن جعفر بن عبد الرحمٰن المخرمی (المتوفی سنہ ۱۷۰ھ) فن حدیث میں علوئے مرتبت کے ساتھ سیرت نبویؐ کے اکابر علماء میں تھے، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ فن مغازی کے امام و سرخیل تھے، امام ترمذی کا قول ہے کہ وہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں[1]۔

(۱۵) ابو محمد عبد الرحمٰن بن عبد العزیز الحنیفی (المتوفی سنہ ۱۶۲ھ) یہ امام زہریؒ اور عبد اللہ بن ابی بکر ابن حزم کے تلمیذ رشید اور واقدی و سعید بن مریم کے استاذ تھے، اپنے زمانہ میں فن سیرت کے شہرۂ آفاق عالم شمار ہوتے تھے، علمائے جرح و تعدیل نے ان کی تضعیف کی ہے، سیرت نبویؐ میں ان کی تالیف واقدی کا بنیادی ماخذ رہی ہے۔

(۱۶) ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن السندی (المتوفی سنہ ۱۷۰ھ) انھوں نے عرصہ تک غلامی کی زندگی گذارنے کے باوجود علم و فضل میں نہایت بلند مقام حاصل کیا اور انھیں مشہور تابعی ابو امامہ ابن سہل کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی تھی، علم حدیث، فقہ اور مغازی ان کے صحیفۂ کمال کے روشن ابواب ہیں، بالخصوص فن مغازی میں ان کا پایہ درجۂ امامت تک پہونچا ہوا ہے، خطیب کا قول ہے کہ وہ فن مغازی کے سب سے زیادہ واقف کار تھے[2]، اس لیے کتب سیرت میں ان کا نام بہت کثرت سے آتا ہے، ان کے اساتذہ میں نافع، موسیٰ بن عمر، محمد بن کعب، ہشام بن عروہ اور تلامذہ میں سفیان ثوری، ابو نعیم، وکیع بن الجراح، لیث ابن سعد اور یزید بن ہارون جیسے جلیل القدر ائمہ شامل ہیں[3]، سیر و مغازی میں غیر معمولی انہماک کے باعث بعض محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے، امام احمدؒ انھیں پسند کرتے تھے[4]، اور فن مغازی میں ان کی بصیرت کے قائل تھے، جرح و تعدیل کے مشہور امام عبد الرحمٰن بن مہدی ابو معشر سے روایت کرتے ہیں[5]، ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۲، ص ۳۰۰ [2] تاریخ بغداد ج ۳، ص ۴۲۷ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۲۰، [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۲۱۲ [5] تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۲۱۔

(۱۷) ابو محمد زیاد بن عبد اللہ ابن الطفیل البکائی (المتوفی سنہ ۱۸۳ھ): انھیں مغازی کے نامور علماء محمد بن اسحاق اور ابن ہشام سے بالترتیب تلمذ و استاذی کا شرف حاصل تھا، بلکہ یہی درحقیقت دونوں کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتے ہیں، اکثر محدثین کی رائے ہے کہ ثقاہت و اتقان میں ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے، لیکن بایں ہمہ ابن اسحاق کی کتاب السیرۃ کے سب سے زیادہ قابل اعتبار راوی یہی خیال کیے جاتے ہیں[1]، صالح بن محمد کا بیان ہے کہ زیاد البکائی بذات خود ضعیف ہیں، مگر کتاب المغازی کی مرویات میں ان سے زیادہ ثبت کوئی نہیں ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سیرت کے عشق میں گھر بار فروخت کرکے اپنے استاذ ابن اسحاق کے ساتھ نکل پڑے تھے، اور زمانۂ دراز تک سفر و حضر میں ساتھ رہ کر کتاب المغازی کی سماعت حاصل کی[2]۔

(۱۸) سلمہ ابن الفضل الابرش (المتوفی سنہ ۱۹۱ھ): یہ بھی محمد بن اسحاق کے تلمیذ خاص اور ان کی کتاب السیرۃ کے مستند راوی ہیں، علمائے حدیث نے ان کی تضعیف کی ہے، لیکن یحییٰ بن معین انھیں مغازی کے باب میں ثقہ اور ان کی کتاب کو سیرت نبویؐ کے ذخیرہ میں ایک بیش بہا اضافہ قرار دیتے ہیں، امام طبری نے ان سے بکثرت روایتیں نقل کی ہیں۔

(۱۹) یحییٰ بن سعید بن ابان الکوفی (المتوفی سنہ ۱۹۴ھ): یہ بھی محمد بن اسحاق اور ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ اگرچہ قلیل الروایۃ ہیں تاہم ثقہ ہیں[3]، حاجی خلیفہ نے انھیں فن مغازی کے مصنفین میں شمار کیا ہے[4]، ان کی کتاب کے بکثرت اقتباسات صحیح بخاری کے باب المغازی میں منقول ملتے ہیں، اسی طرح طبری اور ابن حجر نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(۲۰) ابو العباس ولید بن مسلم الاموی (المتوفی سنہ ۱۹۵ھ) یہ اپنے عہد میں شام کے سب سے

---

[1] وفیات الاعیان ج ۱، ص ۱۹۵ [2] الاعلام زرکلی ج ۳، ص ۹۲ [3] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۸۰۔ [4] کشف الظنون ج ۲، ص ۲۴۱۔

بڑے عالم، محدث اور مورخ تھے، امام اوزاعیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، مغازی ان کا خاص فن تھا، ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ ولید مغازی میں وکیع بن الجراح سے بڑے عالم تھے[1] طویل اور آثار قیامت کے سلسلہ کی احادیث کے خاص طور پر حافظ تھے[2]، امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ علمائے جرح و تعدیل ولید بن مسلم کی ثقاہت اور صحیح الحدیث ہونے پر متفق ہیں[3]، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر ان کی تصنیفات کی تعداد ستر بیان کرتے ہیں[4]، تاہم ان کی تصنیفات کی مزید کوئی تصریح و تفصیل نہیں ملتی ہے، ابن ندیم نے صرف دو کتابوں کا ذکر کیا ہے "کتاب السنن فی الفقہ اور کتاب المغازی[5]"

(۲۱) ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی (المتوفی ۲۰۷ھ) ان کا شمار اسلام کے قدیم ترین مورخین میں ہوتا ہے "الطبقات الکبریٰ" کے مشہور مصنف محمد بن سعد ان کے تلمیذ رشید تھے، واقدی بہت کثیر التصانیف تھے، سیرت نبویؐ کے موضوع پر ان کی دو کتابیں ملتی ہیں؛ کتاب السیرۃ اور التاریخ الکبیر والمبعث والمغازی، علمائے حدیث نے ان کو شدید ترین نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے، حتیٰ کہ عہد آخر میں واقدی کا نام کذب و افتراء کا مرادف خیال کیا جانے لگا، امام شافعیؒ ان کی تصانیف کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے، علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ واقدی کی لغو بیانی مسلمۂ عام اور اس کی کتب سیرت بے بنیاد روایات کا سرچشمہ ہیں، ہم آیندہ صفحات میں سیرت نبویؐ کے ماخذ کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے اس موضوع پر وضاحت سے روشنی ڈالیں گے۔

(۲۲) عبدالرزاق ابن ہمام (المتوفی ۲۱۱ھ): یہ چمنستان اتباع تابعین کے گل تازہ تھے، حدیث میں ان کی شہرۂ آفاق مصنف اپنی قدامت و اولیت کے لحاظ سے مصنف ابن شیبہ سے بھی

[1] شذرات الذہب ج ۱، ص ۳۴۴۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۱۵۴۔ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲، ص ۱۴۶۔ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۶۷ و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۲۔ [5] الفہرست لابن ندیم ص ۳۱۸

بلند پایہ ہے، تبحر علمی، قوت حافظہ اور تثبت و اتقان فی الحدیث میں وہ نادرۂ عصر تھے، انھیں امام مالکؒ، امام اوزاعی، سفیان بن عیینہ، ابن جریجؒ اور معمر بن راشد جیسے یکتایان عہد محدثین سے شرف تلمذ حاصل تھا، خود ان کے چشمۂ فیضان سے تشنگی علم فرو کرنے والوں میں امام احمدؒ، علی بن المدینی، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راہویہ اور حماد بن سلمہ کے نام ملتے ہیں، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ماہرین فن ان کی ثقاہت و عدالت پر بیک زبان متفق ہیں[1]، چنانچہ امام احمد، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، یعقوب بن شیبہ اور ابوداؤد الفریابی وغیرہ جیسے اکابر علمائے جرح نے بصراحت ان کی توثیق کی ہے، بعض علماء نے ان میں رفض و تشیع کے میلان کا بھی اظہار کیا ہے، لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد صرف اہل بیت کرام سے انکی محبت ہے، آخر عمر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے، اس لیے امام احمدؒ کا قول ہے:

اتینا عبد الرزاق قبل المائتین وھو	۲۰۰ھ سے قبل عبدالرزاق کے پاس
صحیح البصر ومن سمع منہ بعدھا	آئے تو ان کی بصارت قائم تھی، پس
ذھب بصرہ فھو ضعیف السماع[2]	جس نے ان کی بینائی زائل ہونے کے بعد
	ان سے حدیثیں سنی ہیں اس کا سماع ضعیف ہے۔

ابن ہمام نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، لیکن اکثر معدوم ہیں، خیر الدین زرکلی اور ابن ندیم نے ان کی جن کتابوں کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں: سنن عبد الرزاق، کتاب فی التفسیر، کتاب السنن فی الفقہ، مصنف عبد الرزاق[3]، علاوہ ازیں فن مغازی میں بھی ان کی ایک تالیف کا ذکر ملتا ہے۔

(۲۳) یونس بن بکیر الشیبانی (المتوفی ۱۹۹ھ): روایت حدیث میں ان کا پایہ گو زیادہ بلند نہیں، مگر اکثر محدثین ان کی ثقاہت کے حق میں ہیں، ہشام بن عروہ اور محمد بن اسحاق کے سامنے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۳۳۴ [2] میزان الاعتدال ج ۲، ص ۱۲۷۔ [3] الاعلام زرکلی ج ۵ ص ۱۸۰ والفہرست ص ۲۲۷۔

زانوئے تلمذ تہ کیا اور مغازی و سیرت میں خصوصی کمال پیدا کیا، چنانچہ علامہ ذہبی نے ان کا تذکرہ قلمبند کرتے ہوئے "صاحب المغازی" کے الفاظ سے ملقب کیا ہے، انھوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے۔

(۲۴) ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری (المتوفی ۲۱۳ھ) یہ ایک ثقہ محدث، نامور مورخ و نحوی اور ماہر انساب کی حیثیت سے شہرۂ آفاق ہوئے، زیاد البکائی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور ان ہی کی روایت سے مغازی ابن اسحاق کی سماعت و تحصیل کی تھی، بقول سیوطی اکابر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، سیرت نبوی میں ان کی تالیف کو قدامت و جامعیت کے اعتبار سے امتیاز خاص حاصل ہے، اس میں انھوں نے صرف سیرت ابن اسحاق کی تلخیص و تہذیب کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے مشکل مطالب و الفاظ کی تشریح و توضیح بھی کی ہے، سیرت ابن ہشام چار ضخیم جلدوں میں متعدد بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے، اس کا ایک اڈیشن ۱۹۳۶ء میں استاذ محمد محی الدین عبد الحمید کی تحقیق کے ساتھ مصر سے شائع ہوا، اسی طرح مصطفی السقا اور عبد السلام ہارون کی تحقیق و تہذیب کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں اس کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن طبع ہوا، امام محمد بن عبد الوہاب نے سیرت ابن ہشام کی تلخیص کی ہے، جو متعدد بار چھپ چکی ہے۔

(۲۵) حافظ محمد بن سعد کاتب الواقدی (المتوفی ۲۳۰ھ) : یہ امام ابو داؤد طیالسی اور محمد بن عمر الواقدی کے اجل تلامذہ میں ہیں، محدثین نے لکھا ہے کہ اپنے استاذ واقدی جتنے زیادہ ناقابل اعتبار ہیں، وہ اتنے ہی زیادہ معتبر اور قابل سند ہیں، خطیب بغدادی رقمطراز ہیں:

كان من اهل العلم والفضل
وصنف كتابا كبيرا فى طبقات
الصحابة والتابعين ومن
بعدهم الى وقته فاجاد واحسن[1]

وہ اکابر اہل علم و فضل میں تھے، انھوں نے صحابہ و تابعین سے لے کر اپنے وقت تک کے لوگوں کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی جو نہایت عمدہ اور بہترین تصنیف ہے۔

بارہ مبسوط جلدوں پر مشتمل اس شہرۂ آفاق تصنیف کا نام الطبقات الکبریٰ ہے جو عام طور پر طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے، اس کی پہلی جلد اور دوسری جلد کا معتد بہ حصہ خاص سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر ہے، باقی جلدوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین کے حالات و تراجم ہیں، اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن تمام روایتوں کے باسند ہونے کے باعث واقدی کی مرویات کو بآسانی الگ کیا جا سکتا ہے، اس کتاب کا اولین اڈیشن لیڈن سے شائع ہوا، اس کے بعد قاہرہ و بیروت سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔

(۲۶) ابو عبد اللہ محمد بن عائذ دمشقی (المتوفی ۲۳۳ھ) : مغازی میں غیر معمولی شغف و مہارت کے باعث "صاحب المغازی" ان کا لقب پڑ گیا تھا، یحییٰ بن معین اور دوسرے محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ان کی کتاب المغازی کا پایۂ اعتبار بہت بلند ہے، ابن سید الناس کی مشہور تصنیف عیون الاثر کے بنیادی ماخذوں میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔

(۲۷) ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ البغدادی (المتوفی ۲۹۹ھ) : یہ تاریخ و سیرت اور ادب کے جلیل المرتبت عالم تھے، حدیث میں ان کو امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معین سے شرف تلمذ حاصل تھا، ان کی مشہور تصنیف التاریخ الکبیر کا ایک معتد بہ حصہ سیرت نبوی ﷺ پر مشتمل ہے۔

(۲۸) امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی ۳۱۶ھ) : امام طبری بڑی جامع الکمالات اور متنوع الصفات شخصیت کے مالک تھے، خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ:

جمع من العلوم مالم يشاركه فيه
احد من اهل عصره[2]

علوم و فنون کی جامعیت میں کوئی ہم عصر ان کا شریک نہیں۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰، ص ۳۲۲ ۔ [2] تاریخ التراث العربی ج ۱، ص ۳۶۱ ۔

چنانچہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ سب میں یکساں مہارت و بصیرت رکھتے تھے، ابن خزیمہ کا قول ہے کہ میں دنیا میں ان سے بڑا عالم کسی کو نہیں جانتا، ابن جریر طبری کی تفسیر کو احسن التفاسیر قرار دیا جاتا ہے، فن تاریخ میں ان کی ۱۳ ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب تاریخ کبیر ہے، اس کی دوسری جلد خاص سیرت نبویؐ سے متعلق ہے، اور اپنے موضوع پر مستند ترین خیال کی جاتی ہے، کیونکہ اس سے امام طبری کی وسعت علمی، کمال وثوق اور تحقیق و نکتہ آفرینی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، بعد کی تمام مستند تاریخیں مثلاً تاریخ ابن اثیر، ابن خلدون، اور تاریخ ابوالفداء وغیرہ سب ابن جریر طبری کی مذکورہ کتاب سے ماخوذ بلکہ اسی کے مختصرات ہیں، استاذ جواد علی نے تاریخ کبیر کے ماخذ کا تحقیقی تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ طبری نے اپنے عہد تک کے تمام مدون تاریخی سرمایہ سے پورا استفادہ کیا ہے[1]۔

سیرت نبویؐ پر متاخرین کی تصنیفات

گذشتہ صفحات میں سیرت نبویؐ کے قدیم اور اساسی آخذ کا ایک جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے، اب ذیل میں ہم علمائے متاخرین کی چند اہم تالیفات سیرت کا ذکر کرتے ہیں، جو قدماء کی مذکورۂ بالا تصنیفات کو اپنے اوراق میں محفوظ کیے ہوئے ہیں، یا ان کی شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں۔

(۱) روض الانف مؤلفہ امام عبد الرحمن السہیلی (المتوفی ۵۸۱ھ): یہ محمد بن اسحاق کی مذکورۃ الصدر کتاب السیرۃ کی شرح ہے، علامہ سہیلی کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے، عہد مابعد کے تمام مؤلفین سیرت نبویؐ کی تحقیقات میں ان کے خوشہ چیں ہیں، مصنف اس کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

تحصل فی هذا الکتاب من فوائد	اس کتاب میں ہم کو بکثرت علمی و ادبی فوائد
العلوم والآداب واسماء	اسماء الرجال و انساب کا علم اور فقہی و نحوی
الرجال والانساب ومن الفقه	معلومات، اور اعراب کی تفصیلات ملیں گی،
الباطن اللباب وتعلیل النحو وصنعة الاعراب	جو ایک سو بیس (۱۲۰) کتابوں سے ماخوذ ہیں،

[1] تاریخ التراث العربی ج ۲، ص ۱۶۱

ماهو مستخرج من ما نیف علی	اس کے علاوہ خود میری ذاتی تحقیق بھی
مائة وعشرین دیوانا سوی ما	اس میں موجود ہے۔
انتجه صدری[1]	

یہ کتاب قاہرہ سے طبع ہو چکی ہے۔

(۲) المختصر فی سیرۃ خیر البشر: مؤلفہ حافظ ابو محمد عبد المومن الدمیاطی (المتوفی ۷۰۵ھ) اس کتاب کی ضخامت اگرچہ صرف سو صفحے ہے، تاہم یہ سیرت نبویؐ کے موضوع پر بیحد اہم تصنیف شمار ہوتی ہے، چنانچہ اکثر مؤلفین سیرت کی کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں، حافظ دمیاطی حدیث، فقہ اور تاریخ میں یکساں مہارت رکھتے اور اپنے عہد کے چند اساطین اہل علم میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کی اس تصنیف کا ایک خطی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے، قاہرہ سے طبع بھی ہو چکی ہے۔

(۳) السیرۃ النبویۃ: مولفہ امام اسماعیل بن عمرو بن کثیر (المتوفی ۷۷۴ھ) چار جلدوں پر مشتمل یہ اہم کتاب ۱۹۶۵ء میں قاہرہ سے شایع ہوئی، حافظ ابن کثیر نے علم و فن کی تاریخ میں ایک مفسر، محدث، مورخ اور فقیہ کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت پائی، انھوں نے تصنیفات کا بہت عظیم ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، جن میں البدایۃ والنہایۃ (۱۴ جلد) تفسیر ابن کثیر (۱۰ جلد) جامع المسانید (۸ جلد) خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں[2]۔

(۴) جوامع السیرۃ: مؤلفہ امام ابو محمد علی بن احمد بن حزم الاندلسی (المتوفی ۴۵۶ھ) اس میں ابن حزم نے حیات نبویؐ کو بہت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ قلمبند کیا ہے، ڈاکٹر احسان عباس اور

[1] روض الانف ج ۱، ص ۱۳۵۔ [2] ابن کثیر کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الدرر الکامنۃ ج ۱، ص ۳۷۳، البدر الطالع ج ۱ ص ۱۵۳، شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۱، آداب اللغۃ ج ۳ ص ۱۹۳، الاعلام زرکلی ج ۱ ص ۳۱۸

ڈاکٹر ناصر الدین الاسد کی تحقیق کے ساتھ ایک جلد میں بعض دیگر رسائل میں شامل کر کے دار المعارف مصر سے طبع ہوئی۔

(۵) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، مولفہ حافظ ابن قیم الجوزی (المتوفی ۷۵۲ھ) یہ شہرۂ آفاق اور عام طور پر متداول کتاب فقہ السیرۃ کے موضوع پر اولین کتاب شمار ہوتی ہے۔ اس میں مؤلف نے صرف سیرت نبویؐ اور وقایع حیات نبویؐ کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے احکام بھی مستنبط کیے ہیں اور بکثرت فقہی مسائل میں علماء کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، نیز بعض احکام کو جدید تحقیقات سے ثابت کیا ہے، غرض ابن قیمؒ نے اپنی اس کتاب کو علمی فوائد، تحقیقی نوادر اور نکتہ آفرینی ہر حیثیت سے مکمل کر کے نہایت مفید اور اہم بنا دیا ہے، مصنف نے اس کے دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے سفر حج کے دوران میں محض قوت حافظہ سے تالیف کی ہے، یہ ہندوستان و قاہرہ سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

(۶) شرح مواہب لدنیہ، مولفہ امام محمد بن عبد الباقی الزرقانی (المتوفی ۱۱۲۲ھ) یہ امام قسطلانی کی مشہور تصنیف مواہب لدنیہ کی شرح ہے، کہا جاتا ہے کہ سہیلی کی روض الانف کے بعد اس موضوع پر کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہے، شرح مواہب آٹھ ضخیم جلدوں میں قاہرہ سے چھپ چکی ہے۔

(۷) السیرۃ الحلبیہ، مولفہ علی بن ابراہیم الحلبی (المتوفی ۱۰۴۴ھ) اس کتاب کا پورا نام "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" ہے، اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اس میں صرف راوی کے نام پر اکتفا کر کے سیرت نبویؐ قلمبند کی ہے، اسانید روایت سے تعرض نہیں کیا ہے، علاوہ ازیں تشریح طلب امور کی وضاحت اور بعض حوادث پر نہایت لطیف پیرایے میں تعلیق لکھی ہے، اس تصنیف نے قبول عام کے دربار میں بہت بلند مقام حاصل کیا، دو ضخیم جلدوں میں

مصر سے ۱۳۴۹ھ میں طبع ہوئی۔

سیرت نبویؐ کے مآخذ کا تنقیدی تجزیہ

آج احادیث نبویہؐ کے بکثرت مجموعے متداول اور مقبول عام ہیں، لیکن ان میں وثوق و اعتماد اور اعتبار و استناد صرف صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ اور مسند امام احمد کو حاصل ہے، محدثین نے روایات کی صحت و سقم اور راجح و مرجوح کو جانچنے اور پرکھنے کے بہت سخت اصول وضع کیے ہیں، یہاں تک کہ رواۃ کی جرح و تعدیل کا ایک مستقل فن اسماء الرجال کے نام سے وجود میں آگیا، جس کے مطابق کسی بھی روایت کے پایۂ اعتبار کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے، بلا شبہ محدثین کا یہ ایک عظیم علمی کارنامہ ہے۔

لیکن اس کے برخلاف سیر و مغازی کی کتابیں مجموعی حیثیت سے کتب حدیث کی ہم پلہ نہیں نہیں ہیں، کیونکہ ان میں تحقیق و تنقید اور اصول نقد و جرح کے اس بلند معیار کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، جو مثلاً احادیث احکام کا خصوصی امتیاز ہے، دراصل مرور وقت کے ساتھ علماء میں یہ ایک عام خیال پیدا ہو گیا تھا کہ مناقب اور فضائل اعمال کے باب میں روایتوں کی تحقیق و تنقید میں زیادہ تشدد و احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صحیح و ضعیف ہر طرح کی روایات کا درج کرنا جائز ہے جیسا کہ حافظ زین الدین العراقی (المتوفی ۸۰۶ھ) اپنی منظوم سیرت کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا	طالب علم کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں
تجمع ما صح وما قد انکسرا	صحیح اور غلط ہر طرح کی روایتیں ہوتی ہیں

چنانچہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ محدثین کے اصول جرح و تعدیل کے مطابق تمام کتب سیرت کی تنقیح و تحقیق ہونی چاہیے، تاکہ ضعیف و بے اصل روایات کی معرفت آسان ہو سکے۔

جیسا کہ صفحات بالا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نبویؐ پر متقدمین اور متاخرین علماء نے بےحد وسیع اور قیمتی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ تمام کتابیں صرف چار مراجع کے محور پر

گردش کرتی ہیں، سیرۃ ابن اسحاق[1]، واقدی[2]، ابن سعد[3] اور طبری[4]، ان میں محمد بن اسحاق کو امام احمدؒ اور بعض دوسرے محدثین نے حسن الحدیث اور ثقہ قرار دیا ہے، اس لیے ان کی روایات بلاشبہ قابل اعتبار ہیں۔

لیکن واقدی کو محدثین نے شدید نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے، امام نسائیؒ کا قول ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، امام شافعیؒ انھیں کذاب قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ "مغلطائی نے واقدی کے بارے میں تعصب سے کام لیتے ہوئے صرف اس کی توثیق کرنے والوں کے اقوال نقل کیے ہیں اور جن لوگوں نے اس کی تکذیب و تضعیف کی ہے، ان سے صرف نظر کیا ہے، درانحالیکہ موخر الذکر طبقہ تعداد اور علم و معرفت دونوں میں پہلے طبقہ سے زیادہ اہم ہے"۔ علامہ عثمانی[1] نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مغلطائی نے تعصب نہیں بلکہ حق و انصاف سے کام لیا ہے، اس لیے کہ واقدی کے بارے میں جادۂ حق و صواب اس کی توثیق کرنا ہی ہے، امام تقی الدین ابن دقیق العید کا بیان ہے کہ

جمع شیخنا ابو الفتح الحافظ فی	ہمارے شیخ ابو الفتح حافظ نے اپنی کتاب
اول کتابہ "المغازی والسیرۃ"	"المغازی والسیرۃ" کے شروع میں وہ تمام
اقوال من ضعفہ ومن وثقہ	اقوال جمع کر دیے ہیں جو واقدی کی تضعیف
ورجح توثیقہ وذکر الاجوبۃ عما	و توثیق کے متعلق منقول ہیں، اور خود انھوں
قیل[2]	نے ان کی توثیق کو مرجح قرار دیا ہے، اور
	ان پر اعتراضات کے جوابات بھی دیے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ واقدی کی ثقاہت اور ضعف کے بارے میں محدثین میں اتفاق نہیں، بلکہ

---

[1] معارف۔ یہ علامہ عثمانی کون ہیں اس کی وضاحت نہیں ہوئی۔ [2] فتح الباری ج ۹، ص ۹۸۔

اختلاف رائے موجود ہے، لیکن بایں ہمہ حافظ ذہبی اور امام نووی کا یہ لکھنا بہت تعجب خیز ہے کہ "واقدی کے ضعف و وہن پر علماء کا اجماع و اتفاق ہے" یہاں اس بات کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا کہ واقدی نے اپنی کتاب میں ہر رطب و یابس کو جمع کر دیا ہے (جیسا کہ کہا جاتا ہے) مگر اس کے باوجود حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ محدث نے اس کی تلخیص کی ہے[1]، جس کا ایک خطی نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے[2]۔

ابراہیم الحربی کی رائے ہے کہ واقدی تاریخ اسلامی کے سب سے بڑے واقف کار اور عارف تھے، انھوں نے دور دراز مقامات پر خود جا کر واقعات کی تحقیق و تنقیح کے لیے جو غیر معمولی جانکاہی اور عرق ریزی کی ہے اس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے، یہ درست ہے کہ عہد جاہلیت کے بارے میں ان کی معلومات کم تھیں[3]، حافظ ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ واقدی ہمارے نزدیک حسن الحدیث ہے[4]، فرید براں محمد بن سعد کی کتاب السیرۃ کا معتد بہ حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، اس لیے سیرت نبویؐ کے باب میں ہم واقدی کی ہر روایت کو غیر معتبر نہیں قرار دے سکتے، بلکہ محدثین کے اصول نقد و جرح کی میزان میں رکھ کر ہر روایت کے ضعف و صحت کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔

امام طبریؒ اور ابن سعدؒ کو محدثین کی بارگاہ میں ثقاہت و تثبت کا اعزاز حاصل ہے، لیکن بایں ہمہ ان کی تصنیفات میں بہت سی غیر مستند اور ضعیف روایات بھی ملتی ہیں، علاوہ ازیں اصل سیرۃ ابن اسحاق آج دستیاب نہیں ہے[5]۔ ابن ہشام نے اس کی تہذیب و تلخیص کر کے اس مہر بند مشک کی خوشبو کو وقف عام کیا، اور آج وہی ذوق شناسانِ علم کی توجہات کا مرکز ہے، لیکن ابن ہشام نے سیرت ابن اسحاق کو زیاد البکائی اور یونس بن بکیر سے حاصل کیا ہے، جن کے بارے میں محدثین کی رائیں کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں، مگر چونکہ

---

[1] معارف۔ اس کے باوجود ابن حجر واقدی کے ضعف و نکارت کے قائل ہیں جیسا کہ اس مضمون میں بھی اوپر گذرا ہے۔

[2] قواعد فی علوم الحدیث ص ۳۴۹ [3] تاریخ التراث العربی ج ۲ ص ۳۰۴ [4] ابن ہمام کی اصل حیثیت فقیہ کی ہے، جبابذہ محدثین کے مقابلہ میں ان کے قول کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ [5] معارف۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی کوشش سے اس کا ایک ٹکڑا رباط سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہو گیا ہے۔

ہر روایت بسند مذکور ہے اس لیے اہل نظر کے لیے اس کے پایۂ استناد کی معرفت آسان ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کتب سیرت کی روایات قبول کرنے میں ہمیں جادۂ اعتدال و توازن پر قائم رہنا چاہیے، اس میں مذکور ہر روایت کو علی الاطلاق قبول کر لینا یا اس بنیاد پر ہر روایت کو ناقابل اعتبار قرار دینا کہ اس میں ضعیف روایتوں کا بھی دخل ہے کوئی معقول و مستحسن بات نہیں ہے، اگر کتب سیرت کے اس عظیم سرمایہ سے ہم نے چشم پوشی کی تو ناقابل تلافی علمی نقصان ہوگا۔

معارف:۔ مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ جلد اول کے مقدمہ میں فن سیرت کی قدیم کتابوں پر مفصل بحث و تبصرہ کیا ہے، اس ضمن میں جا بجا واقدی کے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"علماء میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کیے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں۔" (سیرۃ ج ۱، ص ۱۵)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی ان سے کم نہیں لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلمۂ عام ہے اور اس لیے ان کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے۔" (سیرۃ النبی جلد اول، ص ۲۰)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"واقدی خود تو قابل ذکر نہیں ہیں، لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابل سند ہیں ۔۔۔۔ اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن چونکہ تمام روایتیں بسند مذکور ہیں اس لیے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جا سکتی ہیں۔" (سیرۃ النبی ج ۱، ص ۲۲-۲۳)

آگے پھر لکھتے ہیں:

"سیرت نبویؐ کے متعلق ان (واقدی) کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ، اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہیں، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ انہی کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں۔" (سیرۃ النبی ج ۱، ص ۳۰)

سیرت کی امہات کتب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کر سکتا،

واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنفین اعتبار کے قابل ہیں ۔۔۔۔ ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔" (سیرۃ النبی ج ۱، ص ۴۴-۴۵)

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے معارف جنوری ۱۹۲۶ء اور جنوری ۱۹۲۷ء کی دو اشاعتوں میں نہایت تحقیق، جامعیت اور استقصاء کے ساتھ واقدی کا درجہ و مرتبہ اور ان کی کتاب کی حیثیت

واضح کی ہے،، انھوں نے اس ضمن میں واقدی کے موافقین ومخالفین کی فہرستیں بھی دی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے موافقین کی تعداد بھی کم ہے اور ان سب کا مخالفین کے مقابلہ میں حدیث وروایت میں پایہ بھی بہت کمتر ہے۔

علاوہ ازیں واقدی کو نامور محدثین اور سیرت ومغازی کے مستند ایمہ کی صف میں جگہ دینے کی کوشش دراصل مستشرقین کی ایک سازش ہے جو نہایت مضحکہ خیز ہے، حضرت سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا، تاریخ وسیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈسؔ[1] کا حوالہ دیں۔"

جو لوگ واقدی کی روایتوں کو مستند سمجھتے ہیں ان کا شمار بلند پایہ محدثین میں نہیں ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے اس کے موافق بھی شہادت دی ہے مگر فن کے ناقدوں اور رجال کے واقف کاروں کا بڑا حصہ جس میں امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ داخل ہیں اس کو بے اعتبار، جھوٹا اور دروغ گو کہتا ہے اور اسی لیے اس کی روایتوں کو محدثین نے حدیث اور احکام کی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے۔"

جو لوگ واقدی کی توثیق کے لیے یاقوت کا حوالہ دیتے ہیں ان کا جواب دیتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"دنیا جانتی ہے کہ یاقوت کا شمار ناقدین حدیث اور علمائے اصول میں نہیں ہے، وہ صرف ادب وجغرافیہ وتاریخ کا آدمی ہے، اس کو اشخاص کی جرح وتعدیل سے کیا تعلق ہے؟"

اگر ناظرین زیر نظر مقالہ کے ساتھ معارف کے دونوں مضامین بھی ملاحظہ کر لیں جو مقالات سلیمان جلد دوم میں بھی شامل ہیں تو واقدی کا مسئلہ بالکل منقح ہو جائے گا اور اس کی اصل حیثیت بھی واضح ہو جائے گی۔

---

[1] رینالڈس انگریزی زبان کا مشہور ناول نگار ہے۔

مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی اور انکا تذکرہ
مہر جہاں تاب

از جناب مولوی شمس تبریز خان صاحب رفیق مجلس تحقیقات ونشریات ندوۃ العلماء لکھنو،

(۲)

مولانا لکھتے ہیں کہ مولوی جمال الدین صاحب کے بعد نواب صاحب نے مولوی محمد مبین شاہجہان پوری ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کو نیابت اور مدار المہامی پر بلایا اور کچھ عرصے بعد انھیں رخصت کر دیا، پھر عبد العلی خاں گیاوی مدار المہام ہوئے جو مجھ سے بہت شریفانہ برتاؤ کرتے تھے،...... ۱۳۰۳ھ میں گرفین ریزیڈنٹ (جو کابل میں اپنی سخت گیری کیلئے مشہور ہو چکا تھا) ریاست میں مظالم کی تحقیقات کیلئے بھیجا گیا، اس نے شیخ صلاح الدین کوتوال کو سختی کے الزام میں دس سال کیلئے قید کر دیا، اور نواب صاحب کا منصب وخطاب ضبط کر لیا گیا، میں نے انھیں اس حال میں دیکھا کہ تاج محل کے تالاب کی جانب کمرے میں ایک بے زبان چڑیا کی طرح مقید اور فکرمند بیٹھے تھے، ان کی سخت جانی پر حیرت ہوتی تھی، صرف بیگم صاحبہ ساتھ تھیں اور کوئی قریب بھی نہیں جاتا تھا، ریزیڈنٹ ایک ایک کو بلا کر نواب صاحب اور والیۂ ملک کے بارے میں استفسار کرتا۔

اسی دوران میں کلکتہ کے عبد اللطیف خاں مدار المہام بنائے گئے جن کا مشاہرہ دو ہزار تھا کچھ دنوں کے بعد میجر وارڈ وزیر مقرر کیے گئے، میں نے ایک سال بعد محرری سے استعفا دیدیا، بھوپال سے واپس آکر ٹونک تشریف لے گئے اور کچھ عرصے بعد وہاں سے وطن واپس ہوئے اور مستقل قیام کیا، اور تصنیف وتالیف میں عمر گزار دی، ۱۳۱۲ھ میں ندوۃ العلماء کے اجلاس بریلی میں شریک ہوئے، جہاں انکے بقول تین سو علماء شریک تھے، مولانا لطف اللہ صاحب صدر تھے، اور مولانا حکیم عبد الحی صاحب سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، وہاں سے علیگڈھ گئے، مسلم یونیورسٹی کے بارے میں لکھتے ہیں:

بس بہر آنکہ کہ سید احمد خاں چندہ / لکوک روپیہ برائے آن جمع کردہ وکانہ

وہاں کے مدرستہ العلوم پہنچا جس کے لیے سید احمد خان نے لاکھوں روپیے کا چندہ جمع کیا،

---

[1] مہر جہانتاب ص ۹۴۰

از گستردن دامن دراز کردم دست — اور اسکے لیے کسی دکان کے سامنے دامن

با خد چندہ فرو نگذاشتہ در گرفتن پشیزے — پھیلانے اور دستِ سوال دراز کرنے

ہرگز نہی نکردہ رسیدم [1] — اور چندہ میں ایک پیسہ بھی لے لینے میں

کوئی کوتاہی نہیں کی۔

آخری احساسات اور وفات مولانا سید فخر الدین صاحبؒ خاندانی تربیت اور دینی رجحان کے سبب ہمیشہ اصلاحِ نفس اور فکر آخرت کی طرف متوجہ رہے، مہر جہانتاب میں جابجا اپنی دنیوی اور ملازمت کی مشغولیتوں پر افسوس کرتے ہیں، اور دینی و اُخروی مشاغل میں وقت بسر کرنے کی تمنا کرتے ہیں، اخیر عمر میں یہ احساسات اور بڑھ گئے تھے، اپنی کتاب سیرۃ السادات میں لکھتے ہیں:

"عمر کا آفتاب چھیاسٹھویں منزل پر پہنچا بظاہر اس کے غروب کا وقت قریب ہے بیعتِ طریقت مقتدائے زمانہ حضرت مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی کے دستِ حق پرست پر ہوئی لیکن اس سلسلہ کی نسبت بھی آپ سے کرتے ہوئے ایسی شرم آتی ہے جیسا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاندان ونسب کی نسبت کرتے ہوئے اپنی ناخلفی کا شدت سے احساس ہوتا ہے، کیونکہ ساری عمر بے عملی اور ناہلی میں گذاری اور اب جبکہ زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے اب بھی نافرمانیوں اور گناہوں سے رہائی نہیں ہوئی، ایک پل بھی ایسا نہیں گزرتا کہ دل گناہوں کے خیال سے خالی ہو، اگر طاعات میں سے کسی خیر کی توفیق بھی ہوئی تو کردہ ناکردہ برابر ہے اور ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ منہ پر نہ مار دیجائے، اس یاس میں اگر کچھ آس بندھتی ہے تو محض اس سے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ الخ [2]

وفات کا حال جس سے انکی مقبولیت وحسن خاتمہ کا اندازہ ہوتا ہے، انکے فرزند مولانا عبدالحی صاحب

---

[1] مہر جہانتاب ص ۴۵۷ ، [2] حیات عبدالحی بحوالہ سیرۃ السادات ص ۲۳

لکھتے ہیں:-

"...... یہاں تک کہ مغرب کے بعد نبض ساقط ہوگئی اور سوائے سانس کی آمد وشد کے زندگی کی کوئی علامت باقی نہ رہی، رات کو دس بجے یک بیک جنبش پیدا ہوئی اور دائیں پہلو کی طرف خود بخود جھک گئے اور قلب جاری ہوگیا، اور اس میں اتنی شدت وحرارت پیدا ہوئی کہ سو قدم کے فاصلہ سے لفظ مبارک "اللہ" سنا جاسکتا تھا، قلب مبارک میں ایسی جنبش تھی گویا ایک ایک بالشت اچھلتا تھا، یہ حال رات کے ایک بجے تک رہا، اس کے بعد اضمحلال پیدا ہوگیا، اسوقت اس فقیر نے حاضر الوقت اصحاب سے کہا کہ سورۂ یٰسین پڑھیں، اس کے شروع ہوتے ہی خاموشی اور سکون پیدا ہوگیا، دوبار پڑھنے کی نوبت آئی پھر حاضرین نے تلقین شروع کی حضرت نے ذکر لسانی شروع فرمادیا لبوں اور زبان کی حرکت دیکھنے سے اور آواز قریب جانے سے سمجھ میں آتی تھی، لفظ مبارک اللہ کو پوری تجوید کے ساتھ ادا فرمارہے تھے جیسا کہ زندگی میں عادت مبارک تھی، آخر حالت تک ذاکر رہے، دم واپسیں کے وقت نیچے کا جبڑا اوپر ہوگیا، اور زبان اسم ذات ادا کرنے کے لیے متحرک ہوئی مگر پورے طور پر وہ ادا نہیں ہوسکا تھا کہ جان جان آفریں کے سپرد کردی، وہ رات ہم لوگوں کے لیے شب قدر تھی، محسوس ہوتا تھا کہ ملائکہ رحمت ہر طرف سے ہجوم کیے ہوئے ہیں، تنہائی کی کوئی وحشت اور ایسے شفیق باپ کا سایہ اٹھ جانے سے کوئی صدمہ نہ تھا، قلب میں صاف بسط وانشراح محسوس ہوتا تھا، بیساختہ الحمد للہ الحمد للہ زبان پر جاری تھا، احباب تسبیح وتہلیل میں مصروف تھے اور نماز تہجد پڑھ رہے تھے، ایک ایسی حالت تھی کہ تحریر میں اسکو لانا مشکل ہے، فقیر نے ایسی کیفیات تمام عمر مشاہدہ نہیں کیں، یہ چہارشنبہ کی شب ۱۰ رمضان مبارک ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے، اسوقت والد مرحوم کی عمر ۷۱ سال تھی۔" [1]

---

[1] حیات عبدالحی ص ۲۵-۲۶-

مولانا نے اپنے پسماندگان میں پہلی بیوی سے مولانا حکیم سید عبدالحیؒ اور ایک صاحبزادی شمس النساء (جنھوں نے نوجوانی میں انتقال کیا)، اور دوسری بیوی سے دو صاحبزادیاں شمس النساء زوجہ مولوی سید طلحہ صاحب حسنی ٹونکی اور فاطمہ بی بی زوجہ سید محمد یوسف مرحوم اور ایک صاحبزادہ حافظ سید محمد صابر کو چھوڑا جنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں حفظ کیا اور جن پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ بڑی شفقت فرماتے تھے، وہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں انتقال کر گئے،[1]

تصنیفات پر طائرانہ نگاہ مولانا فخرالدین صاحب خیالیؔ نے نثر میں اظہار خیال کا ذریعہ بیشتر فارسی اور کمتر اردو کو بنایا جبکہ نظم کی ہر صنف میں زیادہ تر اردو ہی میں اظہار خیال کیا ہے، فارسی کے مقابلے میں ان کی اردو غزلیں، مثنویاں اور مسدس زیادہ دلکش اور پُر اثر ہیں، البتہ ان کی فارسی نثر میں ادب و انشاء کی چاشنی، رنگینی، روانی و پختگی، سلاست و شگفتگی موجود ہے، جو انھیں اس عہد کے مستند فارسی نویسوں کی صف میں جگہ دیتی ہے، اسی طرح وہ اردو شاعری میں منشی امیر اللہ تسلیم کے تلامذہ میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، جس پر مستقل تبصرے کی ضرورت ہے جو ان شاء اللہ کبھی کیا جائے گا،

انکی گم شدہ کتابوں میں مولانا عبدالحیؒ صاحب نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے، تاریخ تکمیل گنبد (اردو) چمنستان اردو، جوش دل (اردو کا پہلا دیوان) پریم راگ (بھاشا کا دیوان) دیوان فارسی اور رقعات فخریہ مثنوی بہار تسلیم و جان فخر، اور موجود کتابوں میں دیوان فخر (دوم) مثنوی ماہ و خورشید نگار خانہ چین (مو فخرالدین کو غلام احمد فروغی نے چھپوایا تھا) مسدس خیالی منتخب معانی کے جواب میں مولوی عبدالعلی آسی مدرسی نے لکھوائی اور چھپوائی تھی، نثر خیالی ایک مختصر کتابچہ ہے جسے فروغی نے ۱۲۹۸ھ میں شائع کیا تھا، منجیات خیالی (۲۰ صفحات کا نعتیہ غزلوں اور نظموں کا مختصر مجموعہ ہے، جسے حکیم عبدالحی صاحب نے شائع کیا تھا، واردات خیالی غیر مطبوعہ ہے، عربی میں دعاؤں کا مجموعہ حبل النجات مرتب کر کے اس کا اردو ترجمہ

---

[1] حیات عبدالحی ص ۲۶،

بھی کر دیا تھا، اسی طرح کی کتاب اردو میں مجربات خیالی، کے نام سے مرتب کی تھی، فخر المطالب کے نام سے سیوطی کے کسی رسالے کا ترجمہ کیا تھا، شاہ ولی اللہ کی "انصاف" کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا، اور اس پر فوائد لکھے تھے، ان کی کتابوں میں . . . . . . ایک کتاب آئینہ خیالی ہے، جو ۶۶ اوراق پر مشتمل ہے، اور اردو لغات و محاورات کا فارسی ترجمہ ہے، اور بڑے کام کی ہے، مہر جہانتاب کے بعد انکی دوسری بڑی کتاب حیات السادات ہے، جو ۴۴۴ صفحات کی کتاب ہے، اس کے باب اول میں حسنی سادات کی مختلف شاخوں کا تذکرہ اور نسب نامہ ہے حسینی سادات پر دوسرا باب نامکمل رہا، یہ کتاب اصلاً شجروں اور نسب ناموں پر مشتمل ہے، جو سادات کے سیرت نگاروں کے لیے خاص طور پر بڑی اہمیت رکھتی ہے،

تیسری مفصل کتاب اعلام الہدیٰ ہے، جو ۸۰۰ صفحات پر ہے، جو اصلاً حضرت سید احمد شہیدؒ کے چچا مولانا سید محمد نعمانؒ نے حضرت شاہ علم اللہؒ اور ان کی اولاد و احفاد کے تذکرے میں لکھی تھی جسے مولانا خیالی نے ۱۳۱۰ھ میں "سیرۃ علمیہ" کے نام سے مرتب کیا تھا، پھر اسے مولانا عبدالحیؒ صاحب نے تذکرۃ الابرار، کے نام سے مرتب کیا، مہر جہانتاب کا اردو حصہ ۹۰ صفحات تک لکھ سکے تھے، اور اس میں تاریخ ایران اور تاریخ اسلام کے عباسی دور کا تذکرہ چل رہا تھا،

ان کی اردو نعتوں کا ایک مجموعہ منجیات خیالی کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کے علاوہ کئی مجموعے غیر مطبوعہ ہیں، اور بامقصد اور صحیح نعت گوئی کی ایک روایت قائم کرتی ہیں انھوں نے مجمع البحرین کے نام سے ۴۸ صفحات کی کتاب میں ملا علی قاریؒ کی الحزب الاعظم کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا، جو ان کی قادر الکلامی کا اچھا نمونہ ہے، اردو مثنوی پر انھیں ماہرانہ دسترس حاصل تھی جو نسیم دہلوی اور تسلیم کا فیض کہی جا سکتی ہے، ان کی مثنوی ماہ و خورشید، اور بہار تسلیم بہت کامیاب مثنویاں ہیں، طلسم خیالی، کے نام سے انھوں نے دوسرے ترکیب بندوں کے علاوہ ایک طویل

ترکیب بند لکھا تھا،

اردو غزل میں مومن کی معاملہ بندی وقوعہ گوئی، رنگینی، دلنشینی اور سوز و گداز کی روایت نسیم اور تسلیم سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچی ہے، اور وہ اپنے استاد کی طرح دبستان دہلی، اور مومن اسکول کے نمایندہ شاعر ہیں، جن کے یہاں سید احمد شہیدؒ کے جذبۂ اصلاح و جہاد اور دینی رجحانات اور تعمیری خیالات کا وفور ہے، اسی جذبے کے تحت انھوں نے مسدس حالی کا جواب مسدس خیالی کے نام سے لکھا، اور حالی کی تجدد پسندی کے مقابلے میں راسخ العقیدہ مسلم عوام و خواص کے جذبات کی ترجمانی کی، اور انھیں مغرب کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے کتاب و سنت کی بصیرت اور اسلامی کردار کی قوت اپنانے پر مائل کیا، یہ اور بات ہے کہ اس کا فنی مرتبہ مسدس حالی سے فروتر ہے، جس کے سبب یہ مسدس عام نہیں ہو سکا۔

ہر جہاں تاب پر ایک نظر

مولانا خیالی کا یہ عظیم و ضخیم تذکرہ بڑے سائز کے ۱۳۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اپنے عہد کے اردو فارسی تذکروں سے کئی لحاظ سے ممتاز ہے، سب سے پہلی چیز مصنف کے ذوق کی پاکیزگی لطافتِ طبع اور نقطۂ نظر کی صحت و صداقت ہے، جس کی روح پورے تذکرے میں کار فرما ہے، اسلامیت اور سلامت روی توازن و اعتدال اور خوش مذاقی و شائستگی اول سے آخر تک موجود ہے جس سے ذوق کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے، جیسے تذکرے غیر جانبداری اور دوری و سیع القلبی اور کشادہ نظری کے معیار کے حامل ہیں اور ان میں مورخانہ نقطۂ نظر اپنایا گیا ہے، اور حالات و واقعات مستند کتابوں سے لیے گئے ہیں، اشعار کے انتخاب میں بھی بلند ذوقی اور حسن طبیعت کا ثبوت دیا گیا ہے،

اس تذکرے کی دوسری خصوصیت اس کے دائرے کی وسعت اور اس کے مشتملات کا تنوع اور احاطہ ہے، جو اسے ایک دلچسپ اور ہمہ گیر تذکرہ بنا دیتا ہے، جسے ہم مختصر اسلامی انسائکلو پیڈیا بھی کہہ سکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ حکیم صاحب کے نامور فرزند اور ملک کے ممتاز مورخ و تذکرہ نگار

مولانا حکیم عبدالحئی صاحبؒ کو اپنی کتابیں نزہۃ الخواطر اور الہند فی العہد الاسلامی لکھنے کا خیال اسی تذکرے سے پیدا ہوا ہوگا، انھوں نے ان کتابوں میں اس تذکرے سے بہت استفادہ کیا ہے اور اس کے جابجا حوالے بھی دیے ہیں، انھوں نے گل رعنا میں بھی اس کے بہت سے اقتباسات دیے ہیں، مصنف موصوف کی کوشش یہ ہے کہ حتی الامکان اسلامی تاریخ و ثقافت اور مشاہیر اسلام سے عام قاری کو واقف کر دیا جائے، اور اس کے لیے ایک ایسا دائرۃ المعارف تیار کر دیا جائے، جس سے اس کی عام معلومات ہی میں اضافہ نہ ہو، بلکہ اس کے ذوق کی مناسب تربیت اور اس کی سیرت و شخصیت کی تعمیر و تشکیل بھی ہو اور اس کے اندر اسلامی ثقافت کے چیدہ و برگزیدہ نمونوں کی پیروی کا جذبہ و داعیہ بھی پیدا ہو،

اس تذکرے کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ مصنف کی پوری عمر کی کمائی ہے اور تقریباً تیس سال (۱۲۸۸ھ ـــــ ۱۳۱۸ھ) کے عرصے میں تیار ہوا ہے، جس میں خود مصنف کی ذاتی ڈائری بھی شامل ہے، جو سادگی و بے تکلفی، ایمانداری اور بے نفسی، عالی ہمتی و بلند مشربی کا ایک نمونہ اور آئینہ ہے، اور جس میں ایک بہترین خود نوشت سوانح عمری کی بیشتر خوبیاں اور رعنائیاں موجود ہیں، اس میں مصنف کے وسطی اور جنوبی ہند کا سفر نامہ بھی درج کیا ہے، جس میں بہت سے معروف اور غیر معروف مقامات کی جغرافی و تمدنی معلومات سامنے آتی ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کے تعمیری و تمدنی کارناموں کا تعارف ہوتا ہے، بہت سی تاریخی عمارتوں اور مسجدوں کے فنی حسن اور تکنیکی مہارت کی تفصیل پیش کی گئی ہے، ان کی پیمایش اور ان کا نقشہ بتایا گیا ہے، بھوپال اور حیدر آباد کے معاشرتی و تاریخی حالات اور بہت سی شخصیات کے متعلق چشم دید اور مستند بیانات دیئے گئے ہیں، جو ان ریاستوں کے مورخین کی توجہ کے مستحق ہیں،

بہت سے مشاہیر علماء و شعراء اور معاصر شخصیتوں کے بارے میں ذاتی تاثرات و واقعات

بیان کیے گئے ہیں، جو شاید کسی اور تذکرے میں نہ ملیں، اس لیے ہماری ثقافتی علمی و ادبی تاریخ میں اس تذکرے سے استفادہ ناگزیر ہوجاتا ہے، خصوصاً حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد کی بہت سی شخصیات و واقعات کے لیے یہ تذکرہ ایک اہم اور معتبر ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے،

مشاہیر کے تراجم میں کہیں تفصیل اور کہیں اجمال سے کام لیا گیا ہے، مگر اس طرح کہ شخصیت کی تصویر قاری کے ذہن میں آجاتی ہے اور وہ اس سے بڑی حد تک متعارف ہوجاتا ہے، تذکرے کی زبان ادیبانہ اور انشا پردازانہ ہے، مگر قافیہ آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے، اور تذکرہ و تراجم کے مناسب زبان استعمال کی گئی ہے، جس میں روانی بھی ہے اور برجستگی بھی، مولانا خیالی کے نامور فرزند مولانا عبدالحیٔ صاحب اس کتاب کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

"والد مرحوم کی جو تصنیفات ضائع ہونے سے بچ گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ عجیب کتاب مہرجہانتاب ہے، فارسی زبان میں ایک جلد اُس کی فلسکیپ کی تقطیع میں تیرہ سو صفحوں پر تمام ہوئی ہے، دوسری جلد آدھی لکھی تھی کہ عمر نے وفا نہ کی ...... دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی، جس میں ایشیا کا بڑا حصہ ہوچکا تھا، یہ جلد آدھی ہوچکی تھی کہ انکو یہ بات محسوس ہوئی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں اس کا زمانے نے ورق الٹ دیا ہے، اور چند دنوں میں کوئی اس کا سمجھنے والا بھی باقی نہ رہے گا، اس خیال کے آنے سے ہمت پست ہوگئی، چند دنوں کے لیے قلم رکھ دیا، پھر اپنی گذشتہ محنت پر تاسف ہوا اور اردو میں از سرِ نو لکھنا شروع کیا، دس بارہ جز لکھ چکے تھے، کہ داعیٔ حق کو لبیک کہہ کر خلد بریں کو سدھارے"[1]

تذکرے کے شروع میں مصنف نے تین دیباچے لکھے ہیں، جو فارسی انشا پردازی کے اچھے نمونے

---

[1] گلِ رعنا ص ۵۳۴

کہے جاسکتے ہیں، اُن میں انھوں نے حمد و نعت کے بڑے دل نشین پہلو نکالے ہیں، اس کے بعد دفترِ اول میں ۳۲ علوم کے تعارف میں کہیں تفصیل اور کہیں اجمال سے کام لیا ہے، وہ علوم یہ ہیں: اصولِ دین، تفسیر، حدیث، اصولِ فقہ، صرف و نحو، معانی و بیان اور بدیع، خط، قرأت، تصوف، فرائض، منطق، ہیئت، ہندسہ، حساب، طب، تشریح، عروض و قوافی، انفاس و معرفتِ دم، تعبیرِ رویا، موسیقی، فراست، تکسیر، جفر و نجوم، احکام، آثارِ علویہ و سفلیہ، احاجی، احتساب، احوالِ رواۃ حدیث۔

علم بدیع کے تحت عربی، فارسی اور اردو شعراء اور اپنے کلام سے محاسنِ کلام کے نمونے پیش کیے ہیں ——— پھر دفترِ ثانی کے ذکرِ اول میں قصص الانبیاء مستند حوالوں کے ساتھ لکھی ہے، (ص ۱۵۰ ـ ۲۵۰) پھر خلفائے راشدین، ائمۂ اثنا عشر اور عشرۂ مبشرہ کا ذکر ہے پھر بہ ترتیب حروف تہجی صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کا صدی وار تذکرہ لکھا گیا ہے، ذکرِ ہفتم میں مجتہدین اربعہ کے حالات لکھے ہیں، ائمۂ ثلاثہ کے بالمقابل امام اعظمؒ کے حالات میں تفصیل کی یہ توجیہ کی ہے کہ غیر مقلدین اور اہل حدیث کے ایک گروہ نے امام صاحبؒ پر اعتراضات کیے ہیں، اس لیے محدثین کی شہادتوں سے ان کا ازالہ ضروری تھا، امام صاحب کے تفقہ سے زیادہ بحث نہیں کہ یہ تو متفق علیہ ہے، اس لیے حدیث و رجال سے بحث کی ہے، اور حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے امام صاحبؒ کی تابعیت ثابت کی ہے، اور حدیث میں امام صاحبؒ کے مقامِ تحقیق سے انکار کو کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ قرار دیا ہے،

(صفحہ ۳۹۲ ـــ ۳۹۸)

ذکرِ ہشتم میں قراءِ سبعہؒ اور ذکرِ نہم میں محدثین و اکابر نقشبندیہ اور ذکرِ دہم اور باقی گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی ہجری تک کے علمائے ہند کا تذکرہ لکھا ہے، جس میں بعض عرب علماء کے بھی حالات ہیں۔ ہم یہاں کچھ تراجم کے نمونے پیش کرتے ہیں، تاکہ مصنف کی تذکرہ نگاری اور طرزِ تحریر سامنے آجائے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے تذکرے میں انگریزوں کی وہابیت کے متعلق پھیلائی ہوئی افواہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وآنچہ در عوام بغلط شہرت دارد کہ وی وہابیت داشت، محض افتراست، ای مولوی محمد اسماعیل و جملہ ہمراہیانش ہمہ موحدین متبعین بالسنۃ ابراصول حنفیت بودند اما بسبب رد شرک و بدعت، قدمیکہ آلودہ و ملوث بدعات و شرک بود نعوذ باللہ منہا ترک عادت قدیمہ مشکل دانستہ ایشان را بوہابیت مشہور کردند تا بعدم اتباع این قوم مر ایشان را دلیلی کافی باشد و مردم از وشان وحشت گیرند۔" (ص ۲۰۰)

مولانا عبدالحیٔ بڈھانویؒ

"مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی دہلوی داماد شاہ عبدالعزیز محدثؒ و شاگرد رشید وی برادرانش بود واز محمد بن علی الشوکانی نیز اجازت حدیث دارد، جامع علوم عقلیہ و نقلیہ، فقیہ اصولی، مفسر و محدث، واعظ سحر بیان، زاہد متورع محی السنۃ، ماحی شرک و بدعت عارف خدا آگاہ، غازی فی سبیل اللہ بود، مرید و تربیت یافتہ بزرگ خلیفہ حضرت قدوۃ العارفین امیر المجاہدین الشہید فی سبیل اللہ الاحد السید احمد البریلوی قدس سرہ است

وسالہا در تکیۂ شاہ علم اللہؒ در وطن حضرت موصوف بودہ در سفر بادی ہمراہ بود در سفر جہاد ولایت سکھاں رفیق ماندہ، محن و ریاضات کہ در تحصیل کمالات معنوی بخدمت مرشد کشیدہ بیانش طوالت میخواہد بالجملہ آیتی از آیات اللہ و خاتمۂ ربانین معرفت آگاہ بود وفاتش ہشتم ماہ شعبان روز یکشنبہ سنہ ۱۲۴۳ھ بود" (۳۳)

مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ

حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں انھوں نے نواب صدیق حسن خان کی کتاب سے تلخیص کرتے ہوئے لکھا ہے،

"محمد اسماعیل بن شیخ عبدالغنی یا عبدالغنی العمری بن مسند الوقت شاہ ولی اللہ المحدث دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ یکی از ائمۂ دین و فقہاء محققین و نبلاء محدثین بود پدرش بعمر بست و ہشت سالگی دنیای فانی را پدرود کرد ...... وے را بعد وفات پدر بزرگوار در کنار عم نامدار شاہ عبدالقادر دہلویؒ مولف موضح القرآن تربیت ظاہری و باطنی یافت و بجای فرزند او بود و ہم زانوی ادب در تحصیل کمالات علمیہ و عملیہ و فضائل خاندان خود بخدمت اعمام کرام خویش تہ نمودہ بدرجۂ اعلیٰ از علم و فضل رسید جوہر ذکا او بغایت عالی افتادہ بود، مقدمات عویصہ و مشکلات علوم را زود تر ادراک می کرد بمغز سخن می رسید ولادت او تقریباً در سنہ ۱۱۹۳ھ واقع شدہ، بیعت جہاد با سید احمد رائے بریلوی خلیفہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ بجا آوردہ ہمراہ خیل قافلۂ حجاج و مجاہدین وی بود، این ہمہ ترویج شریعت از شرق تا غرب در رفع بدع و محدثات کہ می بینی و این ہمہ مذاکرۂ علوم و کثرت صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و آبادی مساجد کہ در مردم ہندوستان می گنی بدولت جد و اجتہاد او و مولوی عبدالحیٔ مرحوم است گوئی در سرزمین ہند مثل این دو بزرگوار کہ بجای وے و وزیر شیخ خود بودند درین دوازدہ صد سال کسے نہ برخاستہ۔

تخم اتباع سنت کہ جد وی شاہ ولی اللہ محدث رضی اللہ عنہ درین دیار کاشتہ بود در عہد وی بزرگ و بار آوردہ و ہدایت او از وی نہایت پذیرفت در معقول و منقول یاد پیشینیان از خاطر می بردہ فروع و اصول ائمہ انزا دور تری نشاند، در ہر علم کہ با او سخن رانی کردی امام این فن است مولفاتش در فقہ و حدیث و اصول و جز آن بعض رسائل موجود است انجملہ رد الاشراک او تقویۃ الایمان و تنویر العینین در اصول فقہ، و صراط مستقیم، و رسالہ امامت و ایضاح الحق و مثنوی سلک نور و تنقید الجواب۔"

صراط مستقیم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے نانا کے بھائی مولوی سید سعید الدین صاحب نے

انھیں بتایا (جو مولانا اسماعیل شہید کے ساتھ تکیہ میں رہ چکے تھے، جہاں یہ کتاب لکھی جا رہی تھی) کہ اس کے مضامین سید صاحبؒ کے ملفوظات پر مبنی ہوتے تھے، جنھیں حضرت مولانا شہیدؒ بعد میں لکھتے تھے، اور حضرت سید صاحبؒ کو سناتے تو وہ ترمیم کرتے اور حضرت مولانا اسے قلمرد کر کے دوبارہ تحریر فرماتے تھے۔"[۵۶]

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ — مولانا محمد قاسم نانوتوی بن شیخ اسد علی در ۱۲۴۸ھ متولد شد نام تاریخی او خورشید حسن ست علامۂ عصر یگانۂ دہر متبحر، مناظر، مباحث حسن التقریر ذکی، ماہر در معقولات از عہد طفلی طباع، بلند ہمت، وسیع حوصلہ، جفاکش و جری بودہ در مکتب پیوستہ از ہمسبقان اول می بود، قرآن شریف بہت یسیرہ ختم کردہ، شوق نظم و دریں فن حوصلہ بلند داشت و در طفلی حکایات لہو و لعب بیشتر نظم فرمود در ۱۲۶۰ھ دہلی رفتہ بخدمت مولوی مملوک العلی آغاز تعلم کرد و حدیث بحضور شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی خواند و در ۱۲۷۷ھ بحج بیت اللہ مشرف شد و بعد واپسی در مدرسۂ دیوبند متولی تدریس و رباگردید بعدہ در ۱۲۸۵ھ، دیگر بارہ حج کردہ بعد واپسی در دہلی بمسند افادہ نشست، اکثر از پادریاں و پنڈتان مباحثۂ مذہبی می کرد و غالب می آمد، از تصانیفش حجۃ الاسلام و قبلہ نما مشہور اند بعد ازاں بار سوم بحج بیت اللہ مشرف شد و بعد واپسی بہ تپ مبتلا شد چندی علیل ماند تا روز پنجشنبہ وقت ظہر چہارم جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ در عارضۂ ذات الجنب وفات فرمود مزارش در دیوبند ست مولوی محمود حسن و مولوی فخر الحسن گنگوہی و مولوی احمد حسن امروہی از تلامذۂ وی اند کذا فی الکتاب العاشر عن الفاضل رحیم بخش لاہوری (۵۷)

مولانا محمد علی کانپوری (مونگیری) — ناظم ندوۃ العلماء، فاضلی درویش سیرت متدین با قاعدہ

از سادات بارہہ است و از شاگردان مولانا لطف اللہ علی گڑھی در کانپور توطن گزید و بانی مبانی مجلس ندوہ کہ برائے جمہور اہل اسلام نافع دین و دنیاست، او شدہ و بلی مزدہ منفعتے این بار گراں بر سر گرفتہ سعیش مشکور باد۔[۵۸]

ہم ان اقتباسات کا خاتمہ اس دلچسپ تحریر پر کرنا چاہتے ہیں، جو مولانا نے اپنے لائق فرزند مولانا حکیم عبد الحئی صاحب کے بارے میں لکھی ہے، اس سے ناظرین انکی اس غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو انھوں نے تذکرہ نگاری میں ملحوظ رکھی ہے۔

مولانا حکیم سید عبد الحئی — سید عبد الحئی الملقب بسید احمد خلف اکبر کاتب بحروف ست در ۱۲۸۶ھ بوجود آمدہ، کتب درسیہ ابتدائیہ از صرف و نحو و فقہ و اصول و تفسیر معقولات ابتدائی پیش افاضل لکھنؤ و قدوۃ الافاضل شمس العلماء مولانا محمد نعیم و مولانا فضل اللہ فرنگی محلی و بحضور افاضل بھوپال چوں جناب مولانا مفتی عبد الحق ولایتی و مولانا شیخ محمد بن حسین بن محسن عرب و مولانا سید احمد دیوبندی کرد و صحاح ستہ بحضور جناب مولانا شیخ حسین بن محسن یمنی محدث معروف بہ عرب صاحب در بھوپال قرارت کرد، شیخ صاحب موصوف در حق او پیش افاضل بھوپال در مجمعی از اساتذہ فاتحۂ فراغ خواندہ دعای برکت فرمود و اجازت جمیع علوم داد تحریراً و تقریراً و این فراغ در ۱۳۱۲ دست دادہ۔

و در ہمیں سال سفری طویل گوارا کردہ بخدمت جناب مولانا رشید احمد گنگوہی اقامۃ اللہ علی سر الافادہ و جناب قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی و جناب مولانا نذیر حسین محدث دہلوی و دیگر محدثین و علمائی دیوبند و سہارنپور و نواح پنجاب و دہلی و پیران کلیر حاضر شد و اجازت و سند حدیث تحریری و تقریری حاصل نمود، و ہمہ این بزرگاں لبغرض محبت دینی بچشم عزت نگریستند و توجہ خاص مبذول فرمودند

وہم اجازت وسند حدیث از جناب مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ یافتہ ودست بیعت بدست مبترکہ اوشاں دادہ ودر طب بعضی از ابتدائیات چوں موجز و سدیدی وغیرہ از فقیر راقم خواندہ وشرح اسباب وعلامات از حکیم حافظ محمد عبدالعلی لکھنوی نبیرۂ جناب مولانا استاذ الحکماء حکیم محمد یعقوب طاب ثراہ وطرفی از کلیات قانون للشیخ پیش حکیم عبدالعزیز نبیرۂ ثانی مولانا موصوف ومطب از حافظ عبدالعلی وفرزندشاں کردہ لیاقتی نامہ واستعدادی کاملہ بہم رسانیدہ وہر علمی را ابتدبر وتفکر تمام حاصل نمودہ واز شوال سنہ ۱۳۱۳ھ تا آخر حب استدعا ناظم صاحب ندوۃ العلماء در ندوہ کارش بے مزد کردہ واز محرم ۱۳۱۴ھ بمشاہرہ سی روپیہ بعہدۂ مددگاری ونیابت ناظم مامور وتحریر وتقریر ومواعظ واجوبۂ فتاوی بجا دہند سرگرم وبفضل الٰہی سعادت وعمل نیک وتوجہ بہ علوم دینی روزی دلیست وندوہ کہ مجلسی است کہ بمشورۂ علماء برائے اصلاح اہل اسلام در کانپور قائم شدہ وتا حال بکرمہ تعالےٰ کارش روز بدرود نقش روز افزون است فللہ الحمد علی ان من علینا بتوفیق طلبہ لعلوم الدین وآلاتہ واکرم بالسعادۃ وعلی الخیر اللھم وفقنی وایاہ لسعادۃ الاعمال وحسن خاتمتنا باحسن الاقوال وہذا اربعۃ عشرۃ بعد الالف من سنین الہجرۃ سنہ ۱۳۱۴ھ[1]

---

[1] ارمغان باب ص ۱۹۴

اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں

اسلامی علوم وفنون پر ہندوستان کے علماء نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی فہرست اب تک مکمل نہیں ہو سکی تھی، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند لکھ کر اس کمی کو دور کر دیا ہے، یہ اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، اس میں ہندوستانی علماء کی تصانیف کی فہرست کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی فکری تاریخ بھی قلمبند ہو گئی ہے، قیمت دس روپیہ "منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی صاحب، رام پور

معتبر ہو، مستقل ہو ان کی چشمِ التفات
سایۂ ابرِ گریزاں کب ہے غم خوارِ حیات

اک طرف ہے روزِ روشن اک طرف تاریک رات
دیدنی ہے آج کل آئینۂ ذات وصفات

ناامیدی کفر ہے تو سوچنے کی بات ہے
زہر کو انسان کیوں کہنے لگا آبِ حیات

دیکھیے اِک پُتلۂ خاکی کا منصب دیکھیے
نائبِ یزداں پھر اس پر سربراہِ کائنات

ہر نفس پر زندگی میں کشمکش سی کشمکش
انقلابی کیفیات وحادثاتی کیفیات

سعدؓ وطلحہؓ بوعبیدہؓ، عبدؓ رحمٰن وزبیرؓ
فیضِ صحبت سے بنی ہیں کیسی کیسی شخصیات

حال کی ظلمت میں مستقبل کا سورج دیکھئے
تجھ سے اتنا ربط ہے اے زندگیٔ بے ثبات

میں بغیر اذنِ ساقی شغل کر سکتا نہیں
یوں تو کہنے کے لیے ہوں شاملِ بزمِ حیات

آپ کی نوخیز نظریں کس قدر محتاط ہیں
ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا نشانِ التفات

بے یقینی وقت کی نیرنگیوں سے پوچھ لے
ہر قدم ہر موڑ پر ہوتے ہیں تازہ تجربات

بے اجازت کیسے کہہ دوں اپنی بیخوابی کا راز
لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں میرے غم کی واردات

میرے ہاتھوں میں ابھی امید کی پتوار ہے
سیلِ غم سے کھیلتی رہتی ہے کشتیٔ حیات

ظاہر وباطن میں اتنا فرق ـ کیا کہیے عروج
لب پہ ہے تقدیسِ کعبہ، اور دل میں سومنات

غزل

(از جناب محمد حسین نصرتؔ بھٹکلی)

داماں بوالہوس میں وفا کا ثمر نہ جائے — گلشن میں رائیگاں مرا خونِ جگر نہ جائے

فسق و فجور و ظلم کا پیمانہ بھر نہ جائے — تحت الثریٰ میں آج کا انساں اتر نہ جائے

تشہیر مجھ پہ شاق ہے اپنے خلوص کی، — داغِ جگر پہ میرے کسی کی نظر نہ جائے

یوں ہی جمال پاش رہے غازۂ الم — جب تک عروسِ زیست کا چہرہ نکھر نہ جائے

فردوسِ عافیت کا تصور فضول ہے — جب تک جدید دور کا انساں سنور نہ جائے

دل میرا ہے ازل سے حریفِ تجلیات — آئے کبھی نہ شام، جمالِ سحر نہ جائے

توحید تو یہی ہے اسی کا رہے خیال — ادنیٰ گماں بھی غیر کا دل میں گذر نہ جائے

ہو خواہ کتنا سلسلۂ شامِ غم دراز — سینے سے میرے خواہشِ نورِ سحر نہ جائے

نصرتؔ مرا کلام مہکنے لگا ہے آج، — غزلوں سے بوئے گلشنِ داغِ جگر نہ جائے

غزل

از جناب وارثؔ ریاضی صاحب چمپارن

کلام جس قدر بھی مہمل، مگر ہے دعویٰ سخنوری کا — جدید فکر و نظر کا داعی فریب خوردہ ہے شاعری کا

چراغِ عقل و خرد بھی روشن ہے ماہ و انجم بھی جلوہ گر ہیں — مگر یہ کیا ہے کہ دور تک بھی پتہ نہیں ہے کوئی روشنی کا

جو علم سے آشنا نہیں وہ بشر نہیں نخلِ بے ثمر ہے — کہ علم ہی سے جہاں میں انساں کو شرف حاصل ہے برتری کا

اجڑ چکیں بستیاں وفا کی، رہا نہ اخلاص کا زمانہ — بدل دیا ہے مزاجِ "اہلِ ہوس" نے دنیائے عاشقی کا

یہ کیسا وقت آ گیا چمن پر؟ یہ کون سی ہے بہار ہمدم — کہ چہرہ اترا ہوا ہے پھولوں کا رنگ فق ہے کلی کلی کا

چلو کہ اب چل کے چاند تاروں پہ امن کی بستیاں بسائیں — سنا ہے جنگل کے سب درندوں نے بھیس بدلا ہے آدمی کا

تجھے نہ میں بے وفا کہوں گا، کبھی نہ ذکرِ جفا کروں گا — رہا ہے دستور تیرے مستوں میں عمر بھر ضبط و خامشی کا

نہ ہے یہ جور و جفائے پیہم نہ خوف شاید ناکامیِ محبت — یہ ہے مری زندگی کا حاصل، وہ ہے صلہ میری دوستی کا

مرے نبی رحمتِ جہاں [illegible] محسن زمانہ ہیں — ہوا نہ ہوگا کبھی جہاں میں کوئی بھی ہمسر مرے نبی کا

یہ شہر ہے وحشیوں کا وارثؔ یہاں سبھی لوگ اجنبی ہیں — وہاں توقع وفا کی کیسی جہاں نہیں ہے کوئی کسی کا

مطبوعاتِ جدیدہ

نظرات:۔ از جناب وقار احمد رضوی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۷، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے، ناشر: ملک نورانی، مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر۲، عبداللہ ہارون روڈ کراچی

گو موجودہ دور کے ناقدوں نے اردو خواں طبقہ کو مغربی افکار سے روشناس کرایا، تاہم اصول نقد کو اردو زبان کے مزاج کے مطابق نہ ڈھالنے اور مغربی تنقید کی نقالی کی وجہ سے انھوں نے اصولی و معروضی تنقید کی طرف کم توجہ کی اور ان کی تنقیدیں تمام تر جمالیاتی، مارکسی اور تاثراتی نوعیت کی ہو گئیں، جو عربی و فارسی کے ناقدوں اور مفکروں کے خیالات اور اصول نقد پر بحث و گفتگو سے خالی تھیں، زیر نظر کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اور اس میں نقد و انتقاد کے اصول بھی زیر بحث لائے گئے ہیں، اس کے مصنف پاکستان کے ایک اچھے نئے اہل قلم ہیں اور وہ انگریزی کی طرح عربی زبان سے بھی واقف ہیں اس لیے انھوں نے عربی زبان کے ادیبوں اور ناقدوں کے افکار و خیالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور اس کتاب کے چوتھے باب میں عربی میں معروضی تنقید کے امام قدامہ بن جعفر کے مختصر حالات تحریر کر کے ان کی مشہور کتاب نقد الشعر کا مفصل جائزہ لیا ہے، اس باب سے تنقید، علمی تنقید اور معروضی تنقید کا مفہوم بھی پوری طرح واضح ہو گیا ہے، لائق مصنف نے اصولی و معروضی تنقید پر بحث سے پہلے ادب کی تعریف، ادبی تنقید کے مفہوم اور شاعری کے درجہ و مرتبہ کی تعین علیحدہ علیحدہ ابواب میں وضاحت کی ہے اور ادب، تنقید اور شعر کی تاریخی، لغوی اور اصطلاحی ماہیت و حقیقت بھی بیان کی ہے، پانچویں باب میں نقد کے ان اصول و ارکان کا ذکر ہے جو ادبی سرمایے کو پرکھنے کی کسوٹی ہیں، اس

سلسلہ میں جذبہ، خیال، مواد، ہیئت اور اسلوب کی نوعیت، اہمیت، ضرورت اور اثر آفرینی دکھائی ہے، یہ اس کتاب کا سب سے اہم باب ہے، اس میں ادب و تنقید کے اصول و ضوابط کی تشریح کے ضمن میں بڑی دیدہ وری اور نکتہ آفرینی سے کام لیا گیا ہے، یہ پوری کتاب محنت و کاوش سے مرتب کی گئی ہے، اور برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہے، اس سے مصنف کی سلیقہ مندی اور ستھرے ادبی و تنقیدی ذوق کا پتہ چلتا ہے، ابتدا میں انھوں نے اردو کے تنقیدی ذخیرہ کا مختصر جائزہ لیا ہے، اس سلسلہ میں اردو تنقید اور ترقی پسند تحریک کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کی توازن پسندی اور دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی قرآن فہمی } مرتبہ جناب محمد فاروق خاں صاحب ایم۔ اے، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۳۶ قیمت ۵ روپیہ ۵۰ پیسے

پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن اور تفسیری حواشی موضح القرآن کو بے مثال شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، امتداد زمانہ کے باوجود ان کی سادگی، سلاست اور دلکشی میں زیادہ فرق نہیں آیا ہے، چند برس قبل مولانا اخلاق حسین قاسمی نے موضح القرآن کے محاسن پر بعض رسالے شایع کیے تھے، اور اب جماعت اسلامی کے ایک اہل قلم محمد فاروق صاحب نے موضح القرآن کی مدد سے حضرت شاہ صاحبؒ کی قرآنی فہم و بصیرت پر روشنی ڈالی ہے، پہلے انھوں نے شاہ صاحبؒ کے حالات و کمالات کا مختصر خاکہ تحریر کیا ہے، پھر مختلف عنوانات کے تحت موضح القرآن کے تفسیری حواشی نقل کرکے ان کی خصوصیات اور شاہ صاحب کی قرآن فہمی دکھائی ہے، مصنف اس سے پہلے ہندی میں قرآن مجید کا ترجمہ مختصر حواشی کے ساتھ مرتب کر چکے ہیں جو بہت مقبول ہوا، اس کتاب سے شاہ عبدالقادرؒ کی قرآن دانی کے علاوہ خود ان کی قرآن مجید کے ترجمہ و تحشیہ کے کام سے مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت } مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۸، قیمت نو روپیے پچاس پیسے۔ شائع کردہ: اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

تصوف کے طرق و سلاسل میں سلسلہ چشتیہ ہندوستان میں زیادہ رائج اور مقبول ہوا، اس کتاب میں اس کے فیوض و برکات اور اصول و مناہج کا لب لباب پیش کرکے دکھایا ہے کہ آج بھی چشتی تعلیمات کے اندر روحانی جلا اور اخلاقی سدھار کا پورا سامان موجود ہے، یہ دراصل وہ مقالہ ہے جو سلسلۂ چشتیہ کے مرکز درگاہ اجمیر میں منعقدہ آل انڈیا سیمینار میں پڑھا گیا تھا، اس میں چشتیہ مشایخ کے نظام تعلیم و تربیت کی وضاحت ایسے دلنشین انداز میں کی گئی ہے کہ تصوف کا اصل مقصد، ارادت و بیعت کی حقیقت اور پیر و مرید کی ذمہ داری بھی واضح ہوگئی ہے اور تصوف کے بارہ میں بعض شبہات کا ازالہ بھی ہوگیا ہے، مصنف نے اس سلسلہ میں نفس کشی، ترک دنیا، روح عبادات اور خدمت خلق کی حقیقت بھی موثر اور دلآویز انداز میں بیان کی ہے، اور توبہ، استقامت، صدق و اخلاص اور اطعام و انفاق کو چشتی خانقاہوں کی تعلیم و تربیت کا ماحصل بتایا ہے، آخر میں صوفیائے کرام کے تصور عشق اور ذکر کی حقیقت اور مراقبہ کی غایت کی وضاحت کی ہے، مقالہ نگار کا اصل مقصد اس زمانہ میں چشتی تعلیمات کی معنویت، اہمیت اور ضرورت ثابت کرنا ہے، اس کے لیے انھوں نے پہلے اُس دور کے حالات بیان کیے ہیں جس میں چشتی مشایخ نے اپنا نصاب تعلیم و تربیت جاری کیا تھا، پھر اس مشینی دور کے عقیدوں، فلسفوں اور مذہب میں رسوم و ظواہر کی دراندازی کا ذکر کیا ہے، امید ہے کہ ان کی یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی، جس کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوگا کہ روحانیت و اخلاق کی نایابی کے اس دور میں چشتی تعلیمات ایمان و یقین میں پختگی و استواری اور سیرت و اخلاق کی تعمیر و تطہیر میں معاون بن سکتی ہیں۔

اقبال اور مغربی مفکرین :۔ مرتبہ جناب جگن ناتھ آزاد صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

صفحات ۱۹۲، مجلد مع گردپوش، قیمت بیس روپئے، پتہ:- مکتبہ عالیہ ایبک روڈ (انارکلی) پاکستان

اردو کے مشہور شاعر و اہل قلم جناب جگن ناتھ آزاد ڈاکٹر اقبال کے عاشق و شیدائی ہیں، یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ اس وقت اقبالیات کی معرفت و ترجمانی میں کم ہی لوگ ان کے ہمسر ہوں گے، وہ اقبال پر متعدد مفید کتابیں لکھ چکے ہیں، زیر نظر کتاب میں اقبال اور مندرجۂ ذیل مغربی مفکرین کے افکار و خیالات کا تقابلی جائزہ لیا ہے، بیکن، لاک، کانٹ، فشتے، شوپن ہار، کارل مارکس، نیٹشے، برگساں، دانتے، ملٹن اور گوئٹے، شروع میں اقبال اور فکر یونان کے زیر عنوان یونانی فلسفہ کی اہمیت اور مشہور حکمائے یونان سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے نظریات پر بھی مفید گفتگو ہے، اقبال کے بارہ میں ایک رائے تو یہ ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے تمام فکری دھاروں سے بے نیاز رہے اور دوسرا خیال یہ ہے کہ اقبال کی خود اپنی کوئی فکر اور دین نہیں ہے بلکہ ان کے اکثر خیالات مغربی مفکرین کے خیالات کی صدائے بازگشت ہیں، اس انتہا پسندی کے مقابلہ میں لائق مصنف نے یہ معتدل موقف پیش کیا ہے "اقبال نے اگر مشرقی اور مغربی مفکرین کے خیالات کو اپنایا ہے تو اسی حد تک جس حد تک وہ انھیں قابل قبول تھے، اس کے بعد انھوں نے اپنا راستہ الگ اختیار کیا، مغربی خیالات کو جانچنا پرکھنا اور انھیں اپنانا یا رد کرنا کسی بھی فن کار کی عظمت کی دلیل ہے، اس کے علی الرغم ان سے آنکھیں بند رکھنا یقیناً چھوٹے پن کا ثبوت ہے، اقبال نے مغربی خیالات کی گہرائی میں اتر کر اور کہیں انھیں قبول کر کے اور کہیں رد کر کے اپنے اوریجنل مفکر ہونے کا ثبوت دیا ہے"۔ لائق مصنف نے مذکورۂ بالا مغربی مصنفین اور اقبال کے مشترکہ موضوعات پر اظہار خیال کو موضوع بحث بنایا ہے اور دکھایا ہے کہ ان کے اور اقبال کے خیالات میں کس حد تک موافقت یا اختلاف ہے، اس ضمن میں انھوں نے بڑی دقت نظر سے اقبال کے کلام کا جائزہ لیا ہے، جس سے اقبال کی وہ تحسین یا تردید بھی سامنے آگئی ہے جو انھوں نے مغربی مفکرین کے خیالات کے بارے میں کی ہے، مصنف نے "اقبال اور کارل مارکس" کے زیر عنوان مارکسزم کے متعلق اقبال کا اصل نقطۂ نظر پیش کر کے اس دور کی کئی ممتاز سیاسی و ادبی شخصیتوں کی اس رائے کی تردید کی ہے کہ وہ سوشلزم اور کمیونزم سے قریب یا اسلامی سوشلسٹ تھے، اس سلسلہ میں اقبال کی شاعری کے علاوہ ان کے خطوط اور خطبات سے بھی شواہد پیش کیے ہیں، یہ حصہ خاص طور پر لائق مطالعہ ہے، مصنف اقبال کے بڑے مداح اور عقیدت مند ہیں، وہ انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو نری عقیدت یا بے جا غلو کا نتیجہ ہو، ان کا انداز تمام تر معروضی ہے اور انھوں نے اقبال کو کسی خاص عینک سے دیکھنے کے بجائے صحیح انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، ان کی یہ کتاب اقبالیات میں ایک اچھا اضافہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ہندوستان میں چھپا تھا، یہ دوسرا اڈیشن پاکستان سے شایع ہوا ہے، اس میں کتابت و طباعت کی کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں۔

کتابخانہ ہائے پاکستان:- مرتبہ جناب محمد حسین تسبیحی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۳۰، قیمت ۵۵ روپے۔ ناشر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان دونوں ملکوں کی تحقیقات علمی کی وزارتوں کے اشتراک سے اسلام آباد میں قائم ہوا ہے، اس کا مقصد فارسی زبان و ادب اور اس سے متعلق علوم و فنون کی ترویج و اشاعت ہے، یہ کتاب اسی مرکز سے شائع ہوئی ہے، اس میں پاکستان کے متعدد شہروں کے ڈھائی سو سے زیادہ کتب خانوں کا ذکر اور ان کے اہم مخطوطات کا تعارف درج ہے، ہر کتب خانہ کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی تعداد بھی دی گئی ہے اور بعض کتابوں کی زبانوں، مرکز، مالکوں اور لائبریرین کا ذکر بھی ہے، بعض کتب خانوں کی عمارتوں کی موجودہ حالت اور ان کے مالک یا لائبریرین کے مختصر حالات قلمبند کیے ہیں، بعض شہروں کے متعلق مختصر معلومات بھی درج ہیں، کتابوں کے تعارف میں کاتب و مصنف کے نام، فن، زبان، تقطیع، زمانۂ تصنیف و کتابت اور کاغذ کی نوعیت وغیرہ بیان کی گئی ہے، لیکن کتابوں اور

کتب خانوں کی اکثر تفصیلات ناقص ہیں، کسی کتاب کے مصنف کا ذکر ہے، لیکن کاتب کا نہیں، اسی طرح کسی کے فن، زبان اور زمانہ تصنیف و کتابت کی صراحت کی گئی ہے اور کسی کی نہیں کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ فہرست عجلت میں مرتب کی ہے، اگر ہر کتب خانہ کے ذکر میں زبانوں اور فنون کے اعتبار سے الگ الگ عنوان قائم کیے جاتے تو اس فہرست سے استفادہ میں زیادہ سہولت ہوتی۔

غزل چہرہ: از جناب جمیل نظر صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت طباعت نہایت عمدہ صفحات ۲۴۸ مجلد مع خوبصورت گردپوش قیمت تیس روپیے پتہ: جمیل احمد، معین احمد مکان نمبر ۷ بلاک ۱۹ فیڈرل بی ایریا، النور سوسائٹی، کراچی ۳۸۔

یہ جناب جمیل نظر کی غزلوں کا مجموعہ ہے، ان کی شاعری قدیم روایتوں کی پروردہ ہونے کے باوجود نئے حالات و مسائل کا آئینہ ہے، اس لیے یہ مجموعہ تغزل کی قدیم و جدید علامتوں کا خوشگوار امتزاج ہے، جمیل نظر صاحب کا اصلی وطن بریلی تھا مگر اب پاکستان میں بود و باش اختیار کر لی ہے، ان کے کلام میں پاکستان کے بعض مخصوص حالات خصوصاً طبقاتی، خاندانی اور علاقائی کشمکش کی مذمت اس انداز سے کی گئی ہے کہ غزل کی لطافت میں فرق نہیں آنے پایا ہے، انھوں نے موجودہ پست ذہنیت اور سطحی جذبات و میلانات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے، اس سے ان کی قوت مشاہدہ کا اندازہ اور طبیعت کی دردمندی کا پتہ چلتا ہے، غزل چہرہ جناب جمیل نظر کی غزل گوئی کا اچھا نمونہ اور حسن طباعت میں بے مثال ہے۔

دعوت اسلام: از مولانا محمد عبدالمالک جامی متوسط سائز، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲ بلا قیمت پتہ مولانا افتخار فریدی، فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔

یہ تحریر مولانا عبدالمالک جامی مراد آبادی ثم مدنی نے بڑے اخلاص، دردمندی، دل سوزی اور جذبہ تبلیغ سے سرشار ہو کر لکھی ہے اور اسی جذبۂ صادق سے مولانا افتخار فریدی نے اسے شائع کیا ہے، اس میں بڑے موثر انداز میں مسلمانوں کو ان کا فراموش شدہ فریضۂ دعوت و تبلیغ یاد دلا کر اسلام کی عظیم نعمت کو تمام بندگانِ خدا تک پہونچانے کی دعوت دی گئی ہے اور خیر امت کی حیثیت سے انھیں اس زمانہ کی پھیلی ہوئی مختلف گمراہیوں اور برائیوں کا انسداد کر کے دنیا کو ہلاکت و بربادی سے بچانے کی تلقین کی گئی ہے، کتابچہ کی کوئی قیمت رکھنے کے بجائے صرف اس کی توسیع اشاعت کی اپیل کی ہے، اسلام کی دعوت و اشاعت مصنف و ناشر دونوں کا مشن ہے، اس میں اور رسالہ کی توسیع اشاعت میں ہر شخص کو ان کا تعاون کرنا چاہیے۔

"ض"